آجکل

جنوری 2019 ₹ 22

اردو کا بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر

حسن ضیاء

فون:011-24369189

ڈاکٹر ابرار رحمانی

جلد:77 شمارہ:06

جنوری2019 اگرہن۔پوش شک1940

کمپوزنگ : آئی احمد

سرورق : نشانت پٹیل

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن): وی کے مینا

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ:22روپے سالانہ:230روپے

دوسال: 430روپے تین سال:610روپے

امریکہ،یورپ اور دوسرے ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک سالانہ730روپے

پڑوسی ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک: سالانہ530روپے

خریداری واشتہار کے لیے منی آرڈر، ڈرافٹ اور پوسٹل آرڈر

DG, Publications Division کے نام اس پتہ پر بھیجیں:

بزنس منیجر

جرنلس یونٹ، پبلی کیشنز ڈویژن، روم نمبر56، سوچنا بھون

سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی110003

فون نمبر: 011-24365609

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایتیں بزنس منیجر

کو مندرجہ ذیل آئی ڈی پر میل کریں

pdjucir@gmail.com

مضامین/تخلیقات سے متعلق رابطے کا پتہ:

ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، A-601، سوچنا بھون

سی جی او کمپلیکس، نئی دہلی۔110003

Website: www.publications division.nic.in

E-mail: ajkalurdu@gmail.com

نیا سال مبارک

ترتیب

اداریہ : کثیر لسانی معاشرہ — حسن ضیاء — 4

مقالات:

ہندوستان کے تہوار — کے۔ کے کھلر — 5

میکش کا آگرہ اور ان کی شاعری — ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ) — 8

اے پی جے عبدالکلام: شخصیت اور شاعری — ڈاکٹر عبدالحئی — 10

یاد رفتگاں

فہمیدہ ریاض کی احتجاجی شاعری — خالد اشرف — 13

پس مرگ نہ مجھ پہ ستم کرنا: فہمیدہ ریاض — معصوم مرادآبادی — 18

ملتے ہیں کہاں ساتھ کے کھیلے ہوئے بھائی — ڈاکٹر ریحان حسن — 21

حسن مثنیٰ: ایک دریا جو سمندر میں اتر گیا — سراج نقوی — 23

منظومات

کرشن گوتم، ضیا فاروقی، عبدالسلام عاصم — 25

نیاز سلطانپوری، نسیم عزیزی، شفاعت قلندر — 26

محمد سلیم نثار، مظفر علی شہ میری، عمران راقم — 27

افسانے:

احمق — شموئل احمد — 28

منشی مرغوب — نثار راہی — 31

بہروپ — سید آصف اختر نقوی — 35

ڈراما:

چوراہا — انیس اعظمی — 37

معاصر ادب اور ادیب:

جیلانی بانو کا ناول ایوان غزل — ڈاکٹر وسیم بیگم — 40

تبصرے: — **مبصر** — 43

عوامی مرثیے کی روایت/لئیق رضوی — ڈاکٹر علی احمد فاطمی

بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ/ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری ساحر داؤدنگری

تشنہ لب سفر/جنوں اشرفی — سائرہ عظیم

لیکن/افضل حسین افضل — ڈاکٹر محمد طفیل آزاد

جوہی کی مالا/ڈاکٹر غضنفر اقبال — ڈاکٹر قدسیہ نصیر

مراسلات: — 47

حرف آخر: آنند لہر — ڈاکٹر ابرار رحمانی — 54

کثیر لسانی معاشرہ

فانیؔ دکن میں آ کے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

فانی بدایونی نے یہ شعر تقریباً ایک صدی قبل حیدرآباد کی معاشرت اور تہذیب کے حوالے سے کہا تھا لیکن آج بھی تیز رفتار تبدیلیوں کے باوجود یہ شعر معنویت سے خالی نہیں ہوا ہے۔

ہندوستان معاشرتی سطح پر تہذیبوں اور زبانوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں تھوڑا سا فاصلہ طے کرتے ہیں تو زبان اور لب ولہجہ بدل جاتا ہے۔ یہاں اگر ہم کوئی ایک زبان جانتے ہیں تو وہ قطعی ناکافی ہے۔ ایک سے زائد زبانیں بولنے، سمجھنے، پڑھنے کے بعد بھی اکثر بات نہیں بنتی۔ امرتسر میں سڑک پر رکشہ والے کو اپنی بات سمجھانا ہو یا اس کی بات سمجھنی ہو یا چنئی یا پانڈیچری میں کسی سے راستہ پوچھنا ہو، اکثر ناکامی بھی ہاتھ لگتی ہے۔ عالمی سطح پر بھی، انگریزی کا کتنا ہی علم کیوں نہ ہو، برطانیہ سے باہر یوروپ کے ممالک میں نہ سڑک پر لکھا کوئی سائن بورڈ سمجھ میں آتا ہے نہ ہی مقامی زبان جانے بغیر ہر شخص سے بات کرنا ممکن ہے۔ صرف اسی سے بات چیت ممکن ہے جو تھوڑی بہت انگریزی سمجھتا ہے۔ بسوں، ٹرینوں اور میٹرو کے سفر جیسی ضروریات کی تکمیل میں بھی زبان اکثر مسئلہ بن جاتی ہے۔

ملک میں ایک سے زائد زبانیں جاننے سے متعلق ایک حالیہ مطالعہ میں بعض دلچسپ حقائق سامنے آئے ہیں۔ اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانیں جاننے سمجھنے والوں میں اردو بولنے والے ہندوستان میں صف اول میں ہیں اور ان کی تعداد 62.4 فیصد ہے جب کہ ہندی والے صرف 11.6 فیصد لوگ ہیں جو کوئی دوسری ہندوستانی زبان بھی جانتے ہیں۔ کسی ریاست میں دوسری زبان والے سے آسانی سے بات کرسکنے کے معاملے میں سب سے آگے کیرالہ، اتر پردیش، اترا کھنڈ، دہلی اور ہماچل پردیش ہیں جب کہ دوسری جانب ناگالینڈ، میگھالیہ، اروناچل پردیش، جموں وکشمیر اور منی پور کو اس مطالعے کے مطابق ان مشکل مقامات میں شامل کیا گیا ہے جہاں ایک زبان بولنے والے کا دوسری زبان بولنے والے سے ربط نسبتاً دشوار ہے۔ شمالی ہند کی ہندی بولنے والی ریاستوں اور تمل ناڈو کو ان ریاستوں میں شامل کیا گیا ہے جہاں ایک زبان کی حکمرانی چلتی ہے۔

اس مطالعے میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ اگر کوئی زبان ایک بڑے خطے میں بولی جاتی ہے اور اس زبان کے بولنے والوں کو یہ احساس ہوجائے کہ ان کا اس ایک زبان کا علم ہی زندگی گزارنے کے لیے کافی ہے تو وہ دوسری زبان سیکھنے کے معاملے میں کم ہی مائل ہوتے ہیں۔ ہندی بولنے والوں میں 12 فیصد اور ملک کی دوسری بڑی زبان بنگالی بولنے والوں میں صرف 18 فیصد ہی اپنی زبان کے علاوہ دیگر ہندوستانی زبانوں کا علم رکھتے ہیں۔ ہندی بولنے والی ریاستوں میں ہندوستان کی دوسری زبانیں سیکھنے کا رجحان سب سے کم ہے جب کہ جنوبی ہند میں ہندی سیکھنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہ مطالعہ یہ اشارہ بھی کررہا ہے کہ ہمارے ملک میں اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان کی جانکاری کے معاملے میں انگریزی سرفہرست ہے۔ یعنی اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبان جسے لوگ جانتے ہیں وہ سب سے زیادہ انگریزی ہے۔

مذکورہ بالا مطالعہ سے قطع نظر فی زمانہ یہ حقیقت بڑی دلچسپ ہے کہ ایک ملک کے دوسرے ملک پر قبضہ کرنے کا ماضی کا طریقۂ کار اور استعمار اب نہیں ہے لیکن زبانوں کی سطح پر سابق کالونیاں زبان کے اصل مراکز سے بڑھ کر نئے پڑھنے والے پیدا کررہی ہیں۔ مثلاً آبادی کے اعتبار سے بڑا ہونے کے سبب ہندوستان آج انگریزی کی کتابوں کی اشاعت کے معاملے میں برطانیہ سے ٹکر لے رہا ہے۔ فرانس کی سابق کالونیاں اور اسپین کے زیر تسلط رہے لاطینی امریکی ممالک میں ہسپانوی زبان بولنے، سمجھنے اور لکھنے والے اصل مرکز اسپین سے کہیں زیادہ ہیں اور اپنے سابق آقاؤں کی زبان سے ان کا ربط ضبط زبان بولنے یا سمجھنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ سابق غلام ممالک علمی اور ادبی سطح پر بھی اپنے سابق حکمرانوں کی زبان سے وابستگی رکھتے ہیں۔ اسپین سے دور لاطینی امریکہ کے ممالک ہسپانوی ادب کے نوبل انعام یافتگاں تک پیدا کرتے ہیں۔

2011 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ہندی مادری زبان والے 52.8 فیصد بنگالی، 9.7 فیصد مراٹھی، 8.3 فیصد تیلگو، 8.1 فیصد تمل، 6.9 فیصد ہیں۔ ملک میں چھٹے نمبر پر اردو (5.1 فیصد) ہے۔ جن زبانوں کو مادری زبان ماننے والوں کی تعداد اردو سے کم ہے وہ ہیں گجراتی (5.5 فیصد)، کنڑ (4.4 فیصد) اور اڑیا (3.8 فیصد)۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس وقت بوجوہ، سب سے خستہ حال زبان، اردو ہے۔ اس زبان کے مستقبل کے حسین خواب دیکھنا ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ ان کی تعبیر کے لیے جہد وعمل کے بغیر اس زبان کی حالت بد سے بدتر کی طرف ہی جائے گی۔ اگر ہم کثیر لسانی افراد کے مذکورہ بالا مطالعہ کی روشنی میں دیکھیں تو اس میں شک نہیں ایک سے زائد زبانیں سیکھنا، اردو بولنے والے طبقے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ صرف اردو سے کام چلانا مشکل ہے۔ اردو کو سماجی، معاشی سطح پر وہ آزادانہ حیثیت حاصل نہیں ہے جس کے بل بوتے پر ہمارے سارے کام آسانی سے ہوسکیں۔ اپنی زبان کے ساتھ ساتھ ملک اور بیرون ملک کی دیگر زبانوں کو سیکھنے کی سب سے بڑی ذمہ داری حالات کے تحت اردو بولنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ ورنہ مہارت اور استعداد کے روز افزوں پیمانوں اور روزگار کے منظر نامے میں تیز رفتار تبدیلیوں کا مقابلہ مشکل ہوجائے گا۔ پرانے تعلیمی نظام پر اڑے رہنے سے ہمارا ہی نقصان ہوگا اور مقابلہ میں پیچھے رہ جانا تو دور کی بات ہے ہم مقابلے میں شریک ہی نہیں ہوپائیں گے۔ آنے والے وقت میں دیگر تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ کثیر لسانی معاشرہ ابھرے گا کیونکہ ٹیکنالوجی، جغرافیے کی دوریوں اور ملکوں کے درمیان کھینچی گئی سرحدوں کی لکیروں کو بے معنی بنانے پر آمادہ ہے۔ ساری دنیا کو ایک کرنا سیاست وسفارت کاری کے لیے محض نعرہ ہوسکتا ہے لیکن ٹیکنالوجی، ستائش یا صلے کی تمنا کے بغیر، اس مقصد کی تکمیل کی جانب رواں دواں ہیں اور ایک دوسرے کی زبانوں اور تہذیبوں کے تئیں ہمدردانہ رویہ اور ان سے واقفیت، ضروری ہے۔

حسن ضیاء

کے۔ کے کھلر

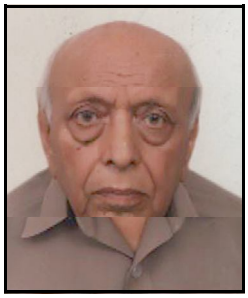

ہندوستان کے تہوار اور مذہبی رسومات

کثرت میں وحدت کے آئینہ دار

ہندوستان تہواروں کا ملک ہے۔ سال میں 365 دن ہیں لیکن تہوار 366 ہیں۔ مہینے کے تیس دن اور چالیس میلے۔ ہفتہ کے آٹھ دن اور نو ڈھیلے۔

ہندوستانی زندگی تہواروں کے بغیر ادھوری ہے۔ تہوار اس ملک کی روح ہیں۔ ہماری ملی جلی تہذیب کی زندہ مثال۔ البیرونی نے اپنی کتاب 'کتاب الہند' میں ہندوستان میں ہندوستانی تہوار پر پورا باب لکھا ہے۔

ہندوستان میں سات قسم کے تہوار ہیں۔

موسمی تہوار جو تین طرح کے ہیں۔

موسم بہار کے تہوار، یعنی بسنت، بیساکھی، برہوا اور سب سے نمایاں ہولی کا تہوار۔ بقول غالب:

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و ماہ تماشائی

پھر آئی لوہڑی، ماگھی، مکر سکرانتی۔

تین عیدیں۔ عیدالاضحیٰ یعنی بقر عید یعنی سلونی عید۔

عیدالفطر یعنی میٹھی عید اور پھر عید میلاد النبیؐ یعنی حضرت محمدؐ کی یوم پیدائش، جو بڑے جوش و خروش سے خاص و عام مناتے ہیں۔

شب برأت کو بھی عقیدت مند بڑے اہتمام سے مناتے ہیں۔

ہندوؤں کے مذہبی تہواروں میں جنم اشٹمی یعنی بھگوان کرشن کا جنم۔ رام نومی یعنی بھگوان رام کا جنم۔ گنیش چترتھی مہاراشٹر کا اہم تہوار ہے اونم جنوبی ہندوستان کا۔

دسہرہ اور دیوالی تو اب عوامی تہوار ہیں۔

عیسائیوں کا گڈ فرائیڈے۔ کرسمس یعنی بڑا دن بھی اب عوامی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ہر شہر میں کرسمس کا بازار لگتا ہے۔

پارسیوں کا 'نوروز' یعنی نیا دن۔ آئین اکبری میں اسے 'عالم افروز' کا نام دیا گیا ہے۔

گروپرو: سکھوں کے تہوار: دس گروؤں کے جنم دن جن میں گرونانک کا جنم دن سب سے نمایاں ہے۔ ہولی جسے سکھ ہولا کہتے ہیں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

بدھ پورنیما: بودھوں اور جینیوں کے تہوار یعنی بدھ پورنیما اور مہاویر جینتی۔

والمیکی جینتی: مہارشی والمیکی جنہوں نے سنسکرت میں رامائن لکھی تھی کا جنم دن۔ کئی صدیوں کے بعد گوسوامی تلسی داس نے رام چرتر مانس لکھی جس کے دوہے آج تک لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔ برج نارائن چکبست کی اردو رامائن اور دل قمر کی گیتا ہندوستان کی بہترین کتابوں میں گنی جاتی ہیں۔

یوم آزادی (قومی تہوار) آزادی کے بعد تین نئے تہوار ابھرے ہیں یعنی یوم آزادی 15 اگست، یوم جمہوریہ 26 جنوری اور گاندھی جینتی 2 اکتوبر۔ یہ تینوں تہوار سرکاری طور پر منائے جاتے ہیں۔

رکشا بندھن (عورتوں کے تہوار): کچھ تہوار عورتوں کی زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً کروا چوتھ جیسے کارا کا چتر تھی، رکشا بندھن، تیج، گوری پوجا، چھٹ جو بہار میں چار دن منایا جاتا ہے۔

مشترکہ تہوار: کچھ تہوار ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، پارسیوں کے مشترکہ تہوار ہیں۔ مثلاً پھول والوں کی سیر، تلا دان یعنی شاہی تہوار جب بادشاہ سونے کے ترازو میں تولے جاتے تھے۔ مسلمان ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ دیوالی بھی دن بدن مشترکہ تہوار بنتا جا رہا ہے۔ گرونانک کو بھی مشترکہ احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم صلح کل ہے۔

بابا نانک شاہ فقیر
ہندو کا گورو مسلم کا پیر

بقول ڈاکٹر اقبال:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

ہندوستان میں تہوار کسی مجمع کا نام نہیں ہے۔ جہاں لوگ رنگ برنگی پوشاکیں پہن کر تفریح کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ مٹھائیاں کھاتے اور بانٹتے ہیں اور رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ یہ تو سب ہوتا ہی ہے لیکن ان میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کے پیچھے ایک جذبہ ہے، ایک فلسفہ ہے۔ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی مشترکہ تہذیب پر ناز ہے۔ یہ وہ تہوار ہیں جو کثرت میں وحدت کی نشاندہی کرتے ہیں اور قومی یکجہتی کو فروغ دیتے ہیں۔

لوہڑی: لوہڑی موسم سرما کا اہم تہوار ہے۔ لوہڑی کی رات کو چوراہے میں بڑے بڑے الاؤ سجائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر گھر، ہر محلے، ہر بازار، ہر مارکیٹ میں الاؤ سجائے جاتے ہیں۔ جن کے ارد گرد لوگ ہاتھ سینکتے ہیں اور جنوری کے کڑاکے کی سردی کا مقابلہ

C-8/8338، وسنت کنج، نئی دہلی۔ 110070

کرتے ہیں۔عورتیں گیت گاتی ہیں اور آدمی بھنگڑا ڈالتے ہیں۔فلم 'ویرزارا' میں لوہڑی کا سین ناقابل فراموش ہے۔لوہڑی کی رات کو امیر غریب کا فرق مٹ جاتا ہے۔لوہڑی کے اگلے روز ماگھی کا تہوار آتا ہے۔ جسے مکر سکرانتی بھی کہتے ہیں۔اب بسنت کو لیجئے جب کھیت، سرسوں ہر چیز پیلی نظر آتی ہے تو امیر خسرو کا کلام پڑھ کر انہی کے نام سے تہوار کی شکل میں منایا جاتا ہے۔گورودیو رابندر ناتھ ٹیگور کا تہوار ہے۔ ہر چیز پیلی نظر آتی ہے۔ پھول، پتے، درخت، زمین آسمان۔کالی داس کا تہوار۔شاعر بھان کا تہوار۔ ہرش وردھن کا تہوار ہے۔جگہ جگہ پیلے حلوے پوری کا لنگر لگتا ہے۔یہ وہ تہوار ہے جس کو منانے سے سب گلے مٹ جاتے ہیں، پرانی دشمنیاں دوستیوں میں بدل جاتی ہیں۔

مکر سکرانتی: عید ملن اور ہولی کی طرح مکر سکرانتی بھی ہے۔مکر سکرانتی کا میلہ مکتسر پنجاب میں خاص مشہور ہے۔لوگ دل کھول کر دان دیتے ہیں۔اس تہوار کا خاص کھانا گنے کے رس کی کھیر ہے۔

لوہڑی: لوہڑی کے ساتھ کئی قصے کہانیاں وابستہ ہیں۔سب سے مقبول قصہ ہے دلاّ بھٹی کا۔

دلاّ ایک مسلم راجپوت ہے جو امیروں کو لوٹتا ہے اور غریبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ کہنے کو وہ ایک ڈاکو ہے لیکن دراصل وہ ایک سخی ہے جسے پنجاب کا رابن ہڈ بھی کہتے ہیں۔ اس نے کئی مظلوم اور غریب لڑکیوں کی شادیاں کروائیں۔

ایک قصہ ایک ہندو لڑکی کا ہے جس کے پیچھے مغل فوجی ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔لڑکی کا باپ ایک غریب کسان تھا۔جب اسے پتہ چلا کہ مغل فوجی اس کی بیٹی کو اغوا کرکے لے جانے کے لیے آرہے ہیں تو اس نے فوراً اس کی شادی طے کردی لیکن گھر میں کچھ کھانے کو نہیں سوائے ایک سیر شکر کے۔

جب وہ باراتیوں کو شکر بانٹ رہا تھا تو عین اسی وقت دلاّ لڑکی کے لیے جہیز اور کھانے کا سامان لے کر پہنچ گیا۔لڑکی کو منہ بولی بیٹی کہا۔بارات کو کھانا کھلایا۔ نئے کپڑے اور زیور دیے اور سسرال روانہ کیا۔

جب مغل سپاہی اس گاؤں میں پہنچے تو لڑکی کی ڈولی سسرال پہنچ چکی تھی۔اس وقت سے آج تک پنجاب کے ہندو اور سکھ ایک مسلمان کے اس احسان کو گا گا کے یاد کرتے ہیں۔اور پنجاب کی سیکولر روایتوں کو زندہ رکھتے ہیں۔

بسنت: بسنت کا تو کہنا ہی کیا ہے۔کوکلا کی دیوی سرسوتی اور محبت کے دیوتا مدن کے پوجن کا تہوار ہے۔ بسنت کی ہر چیز نرالی ہے۔ بچے کی تعلیم بسنت سے شروع ہوتی ہے۔دہلی میں خواجہ بختیار کا کیؒ کے مزار پر ایک میلہ لگتا تھا اور محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر مجلس سماع ہوتی تھی۔ٹیگور کا یہ سب سے پسندیدہ تہوار تھا۔شانتی نکیتن میں یہ تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اور اب بھی منایا جاتا ہے۔ بسنت کے آتے آتے سردی تقریباً ختم ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

آیا بسنت/ پالا اڑنت

پالے کا مطلب سردی ہے

میٹھی عید: اب آیئے عید پر۔میٹھی عید یعنی عید الفطر۔سلونی عید یعنی عید الاضحیٰ اور عید میلا د النبیؐ۔تینوں عیدیں ہندوستان میں بڑی شان وشوکت سے منائی جاتی ہیں۔میٹھی عید یعنی سویوں والی عید رمضان کے 30 یا 29 روزوں کے اختتام پر منائی جاتی ہے۔ پرہیزگار پورے مہینے رمضان میں روزہ رکھتے ہیں۔ یہ مہینہ عبادتوں، برکتوں اور سخاوتوں کا مہینہ ہے۔دیہاتی مسلمانوں کے لیے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر عید منانا ایک قسم کا حج تصور کیا جاتا ہے۔آج بھی دیہات میں روزہ نہ رکھنے والوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔پاکباز ایسے لوگوں کے پاس بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے۔دلّی والے چاند نکلنے کو چاند ہونا کہتے ہیں۔جونہی چاند دکھا شور مچ گیا کہ چاند ہوگیا، چاند ہوگیا۔لوگ ایک دوسرے کے گلے ملتے ہیں۔نئے کپڑے، نئے جوتے، ہر چیز نئی۔لڑکیاں گوٹے کناری سے لبریز ہیں۔کناری بازار دلّی میں تل رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔عورتوں کے ہاتھ مہندی سے رنگے ہوتے ہیں۔عیدگاہیں بھر جاتی ہیں۔نماز کا منظر بھی دیکھنے لائق ہوتا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

مساجد کے باہر فقیروں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔عید کا دن سخاوت کا دن ہے۔ہر ایک کو عیدی دی جاتی ہے۔عید کے دن کی عبادت سے سارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ سلام کرنے والی سہاگنوں کو دعائیں دی جاتی ہیں۔جب بہو ساس کو سلام کرتی ہے تو اسے یہ دعا دی جاتی ہے۔سلامت رہو، دھودو نہاؤ پوتوں پھلو۔غرض کہ میٹھی عید صرف تہوار نہیں بلکہ زندگی کا وہ لمحہ ہے جسے پانے کے لیے پاکباز کوئی بھی قربانی دے سکتے ہیں۔مغل بادشاہ شاہجہاں کے عہد میں عید کے روز شاہی کھچڑی ہر خاص وعام میں تقسیم ہوتی تھی۔یہ کھچڑی ایک دو مصالحوں سے تیار ہوتی تھی اور لینے والوں کی لال قلعہ سے فتح پوری مسجد تک لائنیں لگی ہوتی تھی۔

سلونی عید: اب قربانی کی بات چلی تو سلونی عید سامنے آجاتی ہے۔اس عید کو بقرعید بھی کہتے ہیں۔یعنی اس عید پر جانوروں کی قربانی کی جاتی ہے۔دلّی میں بکرے یا بھیڑ کی قربانی جب کہ عرب ممالک میں اونٹ کی قربانی کی جاتی ہے۔کوئی زمانہ تھا ایک بھیڑ ایک روپے میں بکتی تھی اور ایک بکری دو روپے میں۔آج تو ہزاروں کی بات ہے۔اونٹ تو لاکھ سے کم نہ ہوگا۔مطلب یہ کہ اپنی حیثیت کے مطابق مسلمان جانور خریدتے ہیں۔قربانی کا گوشت دوستوں، رشتہ داروں میں بٹتا ہے۔قربانی کا ایک تہائی حصہ غریبوں، مسکینوں اور فقیروں کو دیا جاتا ہے۔اگر کوئی درویش آپ کے در پر آگیا تو اس کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔درویش کا مسلمان کے گھر آنا بہت اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔منہ مانگی مراد ملتی ہے۔لوگ تو ایسے مواقع کے لیے منت مانگتے ہیں۔نذرانے چڑھاتے ہیں۔

عید میلادالنبیؐ: عید میلادالنبیؐ پیغمبر اسلام کا یوم پیدائش ہے۔اس دن میلاد شریف پڑھا جاتا ہے۔ان کی تعلیمات دوہرائی جاتی ہیں۔ان کے سیرت وکردار پر تقریریں بھی ہوتی ہیں۔بیشتر لوگ روزہ بھی رکھتے ہیں۔غریب غربا میں خیرات کی جاتی ہے۔یہ سلسلہ بارہ روز رہتا ہے۔نعت گوئی کی محافل کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔اس دن کو بارہ وفات کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔کیونکہ حضرت محمدؐ کی پیدائش اور وفات کی تاریخ اسلامی کیلنڈر کے حساب سے بارہ ربیع الاول تھی۔یہ تہوار بڑی سنجیدگی کے ساتھ منایا جاتا ہے۔کوئی عرس نہیں لگتا۔عبادت، سخاوت، تلاوت پر زور دیا جاتا ہے۔

ان تینوں عیدوں پر ہندوستان کے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے بند رہتے ہیں۔ دیوالی، دسہرہ، ہولی، رام نومی، جنم اشٹمی، گرو پرو، نوروز اور کرسمس کی طرح تاکہ عقیدت مندان تہواروں میں شرکت کرسکیں۔

محرم: محرم یعنی حضرت امام حسینؓ کی شہادت۔ یوم عاشورہ کے دن تعزیے نکالے جاتے ہیں۔ بعض عقیدت مند لوہے کی سلاخوں سے اپنی چھاتی پیٹتے ہیں۔ جلوس میں ہندو، سکھ، عیسائی بھی شامل ہوتے ہیں۔ لکھنؤ میں تعزیہ داری بہت بڑے پیمانے پر منائی جاتی ہے۔ ہرامام باڑے کی اپنی الگ ہی شان ہے۔

دیوالی: اب آیئے دیوالی پر جو سارے ہندوستان کا تہوار بنتا جارہا ہے۔ جنوبی ہندوستان کی دیوالی، شمالی ہندوستان کی دیوالی سے ایک دن پہلے منائی جاتی ہے۔ یہ وہ دن ہے جب کہ شری رام راون کا خاتمہ کرکے لکشمن اور سیتا اور ہنومان کے ساتھ اجودھیا میں چودہ سال کے بن باس کے بعد واپس لوٹے تھے۔ اجودھیا کے لوگوں نے دیپ جلا کر ان کا پرجوش استقبال کیا تھا۔ رام سے راجہ رام بنے اور رام راج کی بنیاد رکھی۔ رام راج کا مطلب ہے ایسا سماج جو انصاف پر مبنی ہو۔ جہاں کوئی ذات پات، اونچ نیچ نہ ہو جہاں برابری اور سچائی ہو۔

دیوالی کی تیاری کافی پہلے سے ہی شروع ہوجاتی ہے۔ دیوالی کی رات ہر گھر میں چراغاں ہوتا ہے۔ دیوالی قومی یکجہتی کی شاندار مثال ہے۔ اس روز مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سبھی اپنے ہندو دوستوں کو مبارکباد دیتے ہیں اور ہندو انہیں مٹھائی اور تحفے دیتے ہیں۔ اس تہوار کو روشنی کا تہوار بھی کہتے ہیں۔ اب تو موم بتیاں آگئی ہیں لیکن مٹی کے دیوں کی لمبی قطاروں میں جلنے کا نظارہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہ دیے سرسوں کے تیل سے جلائے جاتے ہیں، جو ساری رات جلتے ہیں۔ جدھر دیکھو روشنی ہی روشنی، آتش بازی دیوالی کا اٹوٹ حصہ ہے۔ جس میں انار، لڑیاں، پٹاخے آدھی رات تک چھوڑے جاتے ہیں۔ بازاروں کا منظر بھی دیکھنے لائق ہوتا ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اس رات لکشمی پوجن ہوتا ہے اور لکشمی ہر اس گھر میں آتی ہے جہاں روشنی ہو۔ پوجا ہو، جتنی زیادہ اتنی جلد لکشمی آئے گی۔ دیوالی کے دوسرے دن ایک اور تہوار ہے بھیا دوج جب ہر بہن اپنے بھائی کے ماتھے پر ٹیکہ لگاتی ہے اور اس کی عمر درازی کی دعا مانگتی ہے۔ اس کے عوض بھائی بہن کو تحفے دیتا ہے۔ ہندوستان میں ان کے علاوہ کچھ اور تہوار بھی ہیں جو بہت عقیدے سے منائے جاتے ہیں۔ مثلاً۔

ہنومان جینتی: اس کا دوسرا نام ماروتی ہے۔ اس دن تلسی داس کا ہنومان چالیسا پڑھا جاتا ہے۔ ہنومان بھگوان رام کا داس تھا۔ اس کی ساری زندگی رام کی سیوا میں گزری۔ ہندوستان میں تقریباً ہر گاؤں اور ہر شہر میں ہنومان کا مندر ہے۔ ہندو عقیدے کے حساب سے ہنومان کی پوجا کرنے سے سارے دکھ دور ہوجاتے ہیں اس لیے ہنومان کو 'سنکٹ موچن' بھی کہا جاتا ہے۔ ہنومان کے بدن کا رنگ پیلا ہے۔ اور اس کا چہرہ لال۔ ہنومان کی پوجا ہندوستان کے باہر بھی ہوتی ہے مثلاً انڈونیشیا میں بس سروس کا نام ہنومان ایکسپریس ہے۔ ان کی ہوائی سروس کا نام گرڑ یعنی گریدا (Garuda) ہے جس پر رام، سیتا، لکشمن اور ہنومان بیٹھ کر لنکا سے اجودھیا واپس آئے تھے۔

ناگ پنچمی سرون: (جولائی۔اگست) کے پانچویں دن منائی جاتی ہے۔ خاص کر بہار میں۔ اس میں ناگ کی پوجا ہوتی ہے۔ متھرا میں جہاں کشان خاندان کا مندر ہے۔ سانپ کی کئی شکلوں میں پوجا ہوتی ہے۔ عورتیں اس دن برت رکھتی ہیں اور ناگوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ کشمیر میں یہ تہوار ناچ گانے سے منایا جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تہواروں کی اس کثرت میں ہندوستان نے اپنی وحدت کو کیسے برقرار رکھا۔

برقرار ہی نہیں بلکہ اور مضبوط کیا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی یہی سوال پوچھا کہ ''کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری'' وہ کیا بات ہے؟ وہ ہے ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت۔ اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے Restricted Holiday کی بنیاد رکھی تھی تاکہ ہندو، سکھ، عیسائی، مسلم سب مل کر ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کریں اور مسلم بھائی ہندوؤں کے تہواروں میں آئیں۔ مثال کے طور پر لوہڑی کا جب الاؤ عروج پر ہوتا ہے تو کسی کو بلانے یا انوائٹ کرنے کی ضرورت نہیں جو آئے الاؤ کے گرد بیٹھ جائے۔ راون میگھ ناتھ کمبھ کرن کے پتلے کون بناتا ہے۔ مسلمان بھائی جو یہ کام صدیوں سے کرتے آرہے ہیں۔ پنجاب میں تو ایک ہی بلڈنگ میں مندر مسجد پائے جاتے ہیں۔ ایک تو اب بھی ہے۔ پنڈوری ضلع گرداسپور تحصیل پٹھان کوٹ میں، جس کا ایک دروازہ مندر کی طرف جاتا ہے اور دوسرا مسجد کی طرف۔ عیدملن میں عوام بلا امتیاز مذہب وملت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔ تعزیوں میں کئی جگہ ہندو، سکھ، عیسائی اکثریت میں ہوتے ہیں۔ اور عیسائیوں کا کرسمس تو تقریباً نئے سال کی طرح ایک قومی تہوار بنتا جارہا ہے۔ ان تہواروں کو سمجھنا ہے تو ان میں شرکت کرنے سے ہی ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا جواب خود بخود مل جائے گا۔

یہ خوشبو پیار کی آئی کہاں سے
یہ سب تہوار ہیں ہندوستان سے

لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تہواروں کی اہمیت اتنی نہیں رہی جتنی تقسیم سے پہلے تھی۔ اب دلّی کو ہی لے لیجئے۔ تہواروں کا پہلے جیسا رنگ وروپ نہیں رہا۔ کوئی زمانہ تھا کہ دلّی کے چاندنی چوک سے ایک نہر گزرتی تھی جو تیس ہزاری سے ہوتی ہوئی لال قلعہ میں داخل ہوتی تھی۔ اس نہر کے دونوں طرف چہل پہل رہتی تھی۔ ہر تہوار میں اس نہر کو اہمیت دی جاتی تھی۔ یہاں دن رات میلہ لگتا تھا۔ قوالیاں گائی جاتی تھیں۔ ہندو اس نہر میں نہا کر پوجا کرتے تھے اور مسلمان اس میں نہا کر روزہ کھولتے تھے۔ لیکن افسوس کہ سرکار انگلشیہ نے یہ نہر بند کروادی۔ دلّی کے کلچر کو ایک زبردست دھکا دیا۔ ویسے بھی ہماری گنگا جمنی تہذیب انگریزی بربریت کو ایک چیلنج تھی۔ آج دلّی کے گلی کوچے اوراق مصور نہیں رہے بلکہ مقامات آہ وفغاں ہیں۔ اگر لالہ مہیشور دیال آج زندہ ہوتے تو دلّی کی حالت زار پر ضرور آنسو بہاتے۔ صرف ایک شخص رہ گیا ہے جو کانٹوں سے بھی نبھائے جارہے ہیں۔ اس کا نام ہے عظیم اختر جو بادشاہوں کے اس مدفن اور ولیوں کے اس نگر میں پرانی دلّی کی شمع کو بجھنے نہیں دے رہا ہے۔

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

☆☆☆

ڈاکٹر نسرین بیگم (علیگ)

میکشؔ کا آگرہ اور ان کی شاعری

وہ عطر دان سا لہجہ میرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

وہ خوشبو جو ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے، جو فضا کو معطر کرتی رہے اور اپنی موجودگی کا احساس کراتی رہے، وہ عظیم شخصیت محمد علی شاہ میکشؔ اکبر آبادی کی ہے۔ آگرہ کی تہذیب جس کی جڑیں رواداری، بھکتی، تصوف، صلح کل، حکمت و فلسفہ کی زمین میں گہرائی تک پیوست رہی ہے اس تہذیب کو آگے بڑھانے میں میکشؔ اکبر آبادی نے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ آج ان کے نام سے آگرہ جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آگرہ کی ادبی تاریخ میں میکش اکبر آبادی کی ذات کئی اعتبار سے اہم ہے۔ وہ اپنی خاندانی وجاہت، شاعرانہ کمال اور خاص طور پر انسان دوستی کی بدولت آگرہ کی محبوب شخصیت ہیں۔

آگرہ بہت پرانا اور تاریخی شہر ہے۔ شاہ نظام الدین دلگیر ایڈیٹر نقاد، سیماب اکبر آبادی، عاشق حسین، بزم اکبر آبادی، مفتی انتظام اللہ شہابی، مخمور اکبر آبادی، نظیر اکبر آبادی، غالب، مولوی نبی بخش حقیر، مہاراجہ بلوان سنگھ، منشی جواہر لال جواہر اور خدائے سخن میر تقی میرؔ کا بھی شہر ہے۔ یہ شہر اکبر اعظم، ٹوڈرمل، بیربل، ابوالفضل، فیضی، مان سنگھ اور عرفی جیسے نامور شعرا کے تعلق سے بھی پہچانا جاتا ہے۔

میکش اکبر آبادی کے پردادا سید امجد علی شاہ اصغر، ان کے صاحبزادے سید منور علی شاہ تھے۔ سید منور علی شاہ کے صاحبزادے سید مظفر علی شاہ ہندوستان کے مشہور صوفی تھے۔ سید مظفر علی شاہ کے صاحبزادے سید اصغر علی شاہ تھے جو میکش اکبر آبادی کے والد تھے۔ میکش اکبر آبادی کی پیدائش مارچ 1902 میں میوہ کٹرہ آگرہ میں ہوئی۔ صوفیانہ ذہن انہیں وراثت میں ملا۔ انہوں نے اپنے آپ کو صوفی نگاہ دیکھا تھا اور تصوف میں ہی اپنی مکمل زندگی گزاری۔ ان کی تصانیف میں میکدہ، حرف تمنا، داستان شب اور نثر میں نغمہ اور اسلام، نقد اقبال، توحید و شرک، مسائل تصوف، حضرت غوث الاعظم کے علاوہ بے شمار مضامین ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔

میکش اکبر آبادی عظیم صوفی شاعر تھے۔ حامد حسن قادری نے میکش صاحب کے بارے میں کیا خوب کہا ہے: ''حلیہ دیکھو تو ٹھیٹھ اکبر آبادی اور دل ٹٹولو تو مکی مدنی بغدادی اجمیری۔'' حامد حسن قادری اس وقت سینٹ جانس کالج آگرہ میں پروفیسر تھے اور پروفیسر عابد حسین فریدی فارسی پڑھاتے تھے اور محمد طاہر فاروقی آگرہ کالج آگرہ میں صدر شعبۂ اردو تھے۔ اس وقت میکش اکبر آبادی کی شاعرانہ عظمت کو سب نے تسلیم کر لیا تھا۔ ان کی غزلوں میں جو تصوف کا رنگ تھا اس رنگ نے ان کی غزلوں میں درد و سوز اور نغمگی پیدا کر دی۔

کر کے اپنے سے الگ میں تجھے دیکھوں تو کیا
اے نمود دو جہاں تو ہے مری آنکھوں کا نور

میکش کے یہاں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فانی بدایونی جیسے شعرا کی نشستیں ہوتی تھیں۔ غرض یہ کہنا درست ہوگا کہ میکش پیدائشی شاعر تھے اور ان محفلوں نے ان کے شوق کو اور بڑھا دیا۔ بقول نیاز فتح پوری:

''میکش آگرہ کی ادب خیز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور وہاں کی عام فنی وزن رکھنے والی ادبی روایات سے واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے کلام میں وزن ہے، فکر ہے، متانت ہے، سنجیدگی ہے اور اسی کے ساتھ شگفتگی اور ترنم بھی۔ ان کے جذبات جتنے ستھرے ہیں اتنا ہی ٹھہراؤ ان کے اظہار میں بھی پایا جاتا ہے۔'' (نگار نومبر 1955)

خوشی سے بھی دلوں کا خون ہو جاتا ہے اے میکشؔ
یہ پھولوں کی طرح کھلتے ہیں تو مرجھا ہی جاتے ہیں

میکش اپنی کتاب ''آگرہ اور آگرے والے'' کا انتساب، آگرے والوں کے نام کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حقیقت سے فسانے تک فسانے سے نگاہوں تک
میرے پاس آتے آتے اس نے کتنے پیرہن بدلے

میکش نے ''آگرہ اور آگرے والے'' میں آگرہ کی پوری تصویر کو سامنے رکھ دیا ہے۔ جس سے آگرے کے رہن سہن اور معاشرے کے شوق اور جہان پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''معاشی بدحالی اور اخلاقی زوال نے سارے نظام کو تہہ و بالا کر دیا ہے۔ سنا ہے کہ ایک زمانے میں ڈیرہ داروں (طوائفوں کی ایک قسم) کا سماج میں ایک اہم مقام تھا اور پوری جاگیرداری، تہذیب ان سے متاثر تھی۔''
('آگرہ اور آگرے والے' میکش اکبر آبادی، صفحہ 27)

آخر میں لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ جاگیردارانہ دور کی اردو شاعری کے معشوق کے کردار کو سمجھنے کے لیے ان طوائفوں کے حالات و معاشرت سے واقفیت لازمی ہے''
(صفحہ 27، آگرہ اور آگرے والے۔ میکش اکبر آبادی)

صدر شعبۂ اردو، بیکنٹھی دیوی گرلس (پی جی) کالج، آگرہ
فون: 09897673824 drnasreenbegum2016@gmail.com

آگرے کے اہل ہنر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے حال میں مست رہے۔ ''شاہ جہاں کے آگرے سے جانے کے بعد آگرہ ایک گوشہ ہو کر رہ گیا اور آگرہ والے گوشہ نشیں۔ میاں نظیر کو نواب واجد علی شاہ نے بلایا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ میں تو وہاں تک جاتا ہوں جہاں تک تاج محل کے مینار نظر آتے رہتے ہیں۔ ساری عمر لڑ کے پڑھا کر گزاری مگر آگرہ نہ چھوڑا۔''
(صفحہ 49، آگرہ اور آگرے والے۔ میکش اکبر آبادی)

آپ نے دیکھا یہ تھا کہ صلح کل کی نگری آگرہ کی مٹی کی محبت اور اس کی سوندھی خوشبو جس نے پھولوں کو بکھرنے نہ دیا۔ میکش کو اپنے وطن آگرہ سے بے انتہا محبت تھی اور کیوں نہ ہوا نہوں نے یہیں کی مٹی میں اپنی زندگی کے شب و روز گزارے تھے:

ہے اس کی خاک میں تیری عمروں کا رنگ و بو
میرا وطن ہمیشہ الٰہی جواں رہے

میکش نے آگرے کے میلے، جیسے تیراکی، اور میاں نظیر کا میلہ جو آگرے کے لیے خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ میلہ 1931 سے شروع ہوا۔ اس زمانے میں آگرے میں نماز اور آرتی کے سلسلے میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ بات کچھ اور تھی بنا دی گئی کچھ اور۔ اس طرح شہر کی فضا خراب ہو گئی۔ دس پانچ آدمیوں کے سر پھوٹ گئے، دس پانچ آدمی رستہ چلتے چوٹ کھا گئے۔ اس زمانے کی لڑائی میں سر ہی پھوٹتے تھے۔ گرے ہوئے آدمی پر کوئی ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ نہ کوئی چاقو چھری کا نام جانتا تھا۔ اس وقت شہر کے صلح پسند ہندو اور مسلمانوں نے مل کر طے کیا کہ میاں نظیر کا میلہ پھر جاری کیا جائے۔ تاکہ آپس میں ملاپ بڑھے اور غلط فہمیاں دور ہوں۔ بسنت پنچمی قریب تھی اس لیے طے ہوا کہ میلہ بسنت کے دن ہو اور شہر سے ہندو مسلمانوں کا ایک جلوس بسنتی کپڑے پہن کر نظیر کے مزار پر چلے اور وہاں جلسہ ہو۔ کپڑے بسنتی تو کسی نے پہننے منظور نہ کیے مگر رومال سب نے بسنتی گلے میں باندھ لیے اور ایک کمیٹی بزم نظیر کے نام سے قائم ہو گئی۔''
(آگرہ اور آگرے والے، میکش اکبر آبادی، مرتب: سید حیدر علی شاہ رند اکبر آبادی، صفحہ 35)

بزم کے ممبران میں رائے صاحب پنڈت برج ناتھ گوسوامی، بابو متھرا پرشاد ملکٹر، ڈاکٹر گور مکھ رام ٹنڈن، بابو درگا پرشاد مہرا، حمید صاحب تاج محلی، مفتی انتظام اللہ صدیقی، مخمور اکبر آبادی اور علامہ میکش اور دوسرے لوگ مقرر ہوئے۔ اس بزم کے پہلے صدر علامہ میکش اکبر آبادی بنائے گئے۔ وہ تا عمر اس بزم کے صدر رہے۔ یہ میلہ یادگار اس لیے بھی ہے کہ ایک مرتبہ اس میلے میں شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم 'کیا ٹھسک دکھائے ہے لونڈا فقیر کا' پڑھی تھی۔

اس کے علاوہ ہولی کے دن بھی کئی محفلیں ہوتی تھیں اور لوگ شریک ہو کر خوشیاں بانٹتے تھے۔ کیلاش کا میلہ، سیتلا کا میلہ، کمال خاں کا میلہ جو آگرہ کینٹ اسٹیشن سے میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر کمال خاں کی قبر ہے اور ساتھ ہی کافی بڑا کنواں جو کمال خاں کے کنویں سے مشہور ہے۔ میکش صاحب آگرہ اور آگرے والے میں لکھتے ہیں:

''اکبر نے ایک باغ لگوایا تھا جس میں نو لاکھ درخت تھے اس لیے اس جگہ کو نولکھا کہتے ہیں۔ اس باغ کو پانی دینے کے لیے یہ کنواں بنوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ کمال خاں ہاتھی کے مہاوت تھے اور ہاتھی سمیت اس کنویں میں کود گئے تھے۔'' (آگرہ اور آگرہ والے ایضاً صفحہ 39)

آج بھی اس بازار کا نام نولکھا ہے۔ کمال خاں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ اس کے علاوہ دیو چھٹ کا میلہ، قلقلیں، گن گوروں کا میلہ، رام لیلا، دشہرہ کا میلہ، کرشن لیلا، آگرے کا محرم وغیرہ۔

میوں ہوں آزاد ہر اک رنگ سے میکش لیکن
دل کو سودا ہے کہ ہر رنگ میں شامل ہو جائے

''نغمہ حیات میں لکھتے ہیں:

کیا تھا بادِ حوادث نے منتشر جن کو — سمٹ سمٹ کے وہ ذرے ہی کوہسار بنے
نہیں ہے ڈر ہمیں اس دور کی تباہی سے — ہم آفتاب بنائیں گے اس سیاہی سے
(میکدہ، میکش اکبر آبادی)

میکش اکبر آبادی کے کلام کی گونج آج بھی آگرے کی محفلوں میں سنائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی نغمگی اور ترنم ہے۔

نیاز فتح پوری ان کی غزل گوئی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ (میکش) محض حسن و عشق کے شاعر نہیں ہیں لیکن ان کی شاعری کی بنیاد یکسر خلوص اور صداقت ہے اور وہ معاملات کو بھی جمالیاتی نظریہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ وہ سوچ کر شعر کہتے ہیں اور سننے والے کو بھی اپنے دائرۂ فکر میں کھینچ لاتے ہیں۔'' (نگار۔ کراچی، نومبر 1955)

میکش اکبر آبادی اپنے جذبات کا اظہار بالکل صاف اور سادہ طریقے سے کر دیتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

تیری زلفوں کو کیا سلجھاؤں اے دوست — میری راہوں میں پیچ و خم بہت ہیں
تیری نظروں میں کچھ سحر ہے ظالم ورنہ — اپنے قابو میں بھی مشکل ہی سے ہم آتے ہیں

میکش کی شاعری ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ ان کے اندر تہذیب و شائستگی، شرافت، ایثار، دردمندی اور اخلاق و مروت ہے۔ وہ جیتی جاگتی تصویر اور آگرے کی جامع کمالات شخصیت ہیں۔ آگرے ہی نہیں بلکہ ان کی انکساری اور تواضع کا چرچا بین الاقوامی سطح پر بھی ہونے لگا ہے۔ یہ اہل آگرہ کے لیے فخر کی بات ہے۔ مجاز لکھنوی نے علامہ میکش اکبر آبادی کے آستانے سے ہی شاعری کی دہلیز پر قدم رکھا اور باکمال شاعر بن گئے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے

علامہ میکش اکبر آبادی کی شاعری محبت کے سوا کسی اور جذبے کی نمائندگی نہیں کرتی ہے۔ آج اس محبت کی شمع کو ہر دل میں جلانے کی ضرورت ہے۔ یہاں رنگ صلح کل میں جو محبت کی شمع روشن کی گئی ہے۔ آیئے ہم سب مل کر یہ عہد کریں کہ اس شمع کو کبھی بجھنے نہ دیں گے کیونکہ شہر آگرہ محبت کی علامت تاج محل سے ہی پوری دنیا میں جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کچھ ذمہ داریاں ہم پر بھی چھوڑی ہیں:

کاش جانے تو ہر اک انسان کو اپنا ہی جز
کاش سمجھے ساری دنیا ہی کو تو اپنا وطن

محبت کے پیغام کو عام کرنے والی وہ عظیم شخصیت اپریل 1991 میں ہم سے جدا ہو گئی اور اپنے پیچھے تاریخ و تہذیب، شعر و سخن کی طویل داستان چھوڑ گئے۔ آج لوگ ان کی محبت، انسان دوستی کے قائل اور قدر دان ہیں۔ وہ اپنی انسان دوستی کی وجہ سے ہی آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور کے مندرجہ ذیل اشعار سے بھی میکش کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے:

آج میکش سے ملاقات میں محسوس ہوا — ہند میں صاحب عرفان ابھی باقی ہیں
لاکھ برباد سہی پھر بھی یہ ویراں تو نہیں — اس خرابے میں کچھ انسان ابھی باقی ہیں

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالحئی

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام: شخصیت اور شاعری

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام ایک ایسی شخصیت ہیں جن پر لکھنا کسی اعزاز سے کم نہیں۔ وہ نہ صرف ایک اچھے سائنس داں تھے بلکہ ایک اچھے شاعر، ادیب اور عظیم انسان بھی تھے۔ انھوں نے ایک مثالی زندگی گزاری ہے۔ ایک ایسی زندگی جو لاکھوں کروڑوں لوگوں کے لیے ایک تحریک بن گئی ہے۔ ملک میں یوں تو بہت سارے سائنس داں ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنے میدان میں عظیم کارنامے بھی انجام دیے ہیں لیکن عبدالکلام کا نام اور ان کی شخصیت سب سے منفرد ہے اور یہ انفرادیت محض ان کی علمی لیاقت یا صلاحیت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ ان کے اخلاق حسنہ اور ایک نیک انسان ہونے کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے جہاں زندگی میں مقبولیت اور کامیابی کی نئی تاریخ لکھی وہیں اپنی نیکی، سادگی اور شرافت سے لوگوں کے دل جیتے۔ یہاں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ وہ ایک آئیڈیل شخص کے طور پر جانے جاتے رہیں گے۔ اقبال نے جس آئیڈیل انسان کی بات کہی تھی وہ ایسا ہی ہوسکتا ہے۔ عبدالکلام نے اپنی پوری زندگی قوم کے نام وقف کردی تھی اور دوسروں کی خوشیوں اور غم کو اپنا لیا تھا۔

شاعر مشرق اقبال نے جس مرد مومن کا خاکہ کھینچا ہے وہ کسی حد تک عبدالکلام کی شخصیت پر پورا اترتا ہے۔ اقبال کے مرد مومن کی پہچان ہے کہ وہ آزادانہ فطرت کا مالک ہوتا ہے اور کسی بھی دنیاوی طاقت سے خوف نہیں کھاتا ہے۔ مشکلات کبھی اس کے لیے سدراہ ثابت نہیں ہوتی ہیں اس میں وہ حرکت اور سوز نہاں ہوتا ہے جو موت کے بعد کی آسودگی قبول نہیں کرتا ہے۔ اُسے حیات جاوید حاصل ہوتی ہے۔ اقبال نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان کی اندرونی قوت، خداترسی، ایمان، عشق، عبادت و ریاضت، اخلاق و محبت اس کے اعلیٰ کردار سے ہی جلا پاتی ہیں۔ اقبال کے بیان کردہ ان اوصاف کی روشنی میں اگر اے پی جے عبدالکلام صاحب کی شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ساری خوبیاں ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتے تھے بلکہ انھیں خدا پر بھی یقین کامل تھا اور اپنی کامیابی اور عظمت میں وہ اللہ کا ہی ہاتھ مانتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر میں یہ کہوں کہ میری زندگی ہر کسی کے لیے کردار کا نمونہ ہوسکتی ہے تو یہ میری بہت زیادہ خوش گمانی نہیں ہوگی لیکن پھر بھی گمنام جگہوں پر اور غیر مراعات یافتہ ماحول میں رہنے والے بعض غریب بچوں کو شاید اس میں کچھ تسکین ملے کہ کس طرح میری تقدیر سنواری گئی ہے۔ شاید یہ ایسے بچے کو اپنی خیالی پسماندگی اور مایوسی کی بندشوں سے خود کو آزاد کرانے میں مدد کرسکے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں انھیں واقف ہونا چاہیے کہ اللہ ان کے ساتھ ہے اور جب اللہ ان کے ساتھ ہے تو کون ان کا مخالف ہوسکتا ہے:

اللہ نے باور کرایا مگر یہ ہے دن کو بنایا برائے مشقت
کرتی سکوں کا تقاضا ہے محنت رستے منور رہیں گے تمہارے

(پرواز، ص 187، قومی اردو کونسل، نئی دہلی 2005)

اقبال کے مطابق انسانی زندگی حرکت و عمل کا دوسرا نام ہے۔ ہمارا مذہب اسلام بھی حرکت و عمل کی دعوت دیتا ہے۔ دنیا میں وہی انسان کامیاب ہوا ہے جس نے نامساعد حالات کا سامنا کیا اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ عبدالکلام کی زندگی حرکت و عمل کی زندہ مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''تمہیں مجھے ہر کسی کو اللہ نے اس سیارے پر ایک آزاد انسان کی حیثیت سے بھیجا ہے تاکہ وہ اپنے باطن کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کی پرداخت کرسکے اور اپنے ضمیر کے مطابق سکون و اطمینان سے زندگی گزار سکے۔ انتخاب کرنے اور اپنی قسمت کو بنانے میں ہمارا راستہ مختلف ہوتا ہے۔ زندگی ایک مشکل کھیل ہے۔ اپنے انسان ہونے کے پیدائشی حق کو اپنے تصرف میں رکھتے ہوئے تم اسے جیت سکتے ہو۔ اس حق کی حفاظت میں تمھیں ان معاشرتی اور بیرونی خطرات کو مول لینا پڑے گا جو دباؤ کو نظرانداز کرنے میں مضمر ہوتے ہیں۔ دباؤ کا تقاضا ہوتا ہے کہ چیزیں دوسروں کے طریقے کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ اب سے پچیس صدی قبل فیثاغورث نے کہا تھا ''سب سے زیادہ اپنی عزت کرو۔''

(پرواز، ص 197)

اقبال نے جہاں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور اقوام کی تعلیمات دی ہے ٹھیک اسی طرح عبدالکلام بھی دیگر مذاہب کا احترام کرتے تھے اور قرآن کے ساتھ گیتا اور بائبل کو بھی مقدس کتابیں سمجھتے تھے لیکن ان کی زندگی کا محور قرآنی تعلیمات ہی تھیں۔ وہ ایک سچے اور پکے مسلمان تھے۔ انھوں نے اپنی کوششوں سے ہندوستان کو سپر پاور بنایا اور ملک کے ہر شہری کے دل میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ حضرت محمدؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ تمھیں اچھائی اور نیکی جہاں سے ملے حاصل کرو اور اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے عبدالکلام نے

شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025-
فون: 9899572095 ahaijnu@gmail.com

بھی ایک مثالی زندگی گزاری۔ عاجزی اور انکساری ان کے مزاج کا خاصہ ہیں۔ وہ ہر روز قرآن کا مطالعہ کرتے تھے. فجر کی نماز روز پڑھتے تھے۔ انھوں نے پوری زندگی ایک مثالی مسلمان کے طور پر گزاری۔

جناب ایس ایم خان اپنی کتاب 'عوام الناس کے صدر' میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر کلام ایک سچے مسلمان تھے۔ وہ فجر کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ تقریباً ہر روز وہ قرآن شریف اور اکثر بھگوت گیتا کا بھی ورد کیا کرتے تھے... دیگر مذہبی کتب مثلاً بائبل، توریت اور خلیل جبران کی تخلیقات میں ان کی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنے مذہب کے بارے میں بڑھ چڑھ کر باتیں نہیں کہیں، لیکن پوری زندگی مذہب کی اعلیٰ ترین اقدار کے مطابق گزاری۔ انھوں نے دوسرے سارے مذاہب کے لیے احترام کے جذبے سے سرشار اور عملی طور پر گہری روحانیت سے پر، ایک سچے مسلمان کی زندگی بسر کی۔ رمضان کے مہینے میں روزہ رکھتے تھے۔ ختم تراویح پر انھوں نے اپنے دور صدارت کے دوران ہر سال راشٹر پتی بھون کی مسجد میں شرکت کی۔ انھوں نے بنی نوع انسان کی خدمت کو سب سے اہم مذہبی فریضہ کے طور پر سمجھا، ان کا خیال تھا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے اور اسے دیگر انسانوں سے معاملات پر اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیے۔ وہ اکثر و بیشتر قرآن شریف کے سورۃ الکافرون کی آیت لکم دینکم ولی دین کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جس کا مفہوم تھا کہ تمھیں تمھارا دین بھلا اور مجھے میرا۔''

(عوام الناس کے صدر، ایس ایم خان، ص6، قومی اردو کونسل 2017)

اے پی جے عبدالکلام کو دنیا میزائیل مین، عوام الناس کے صدر، ایک قابل تقلید استاد اور ایک عظیم شخصیت تسلیم کرتی ہے۔ ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو میں وہ اپنی ذات میں یکتا نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک پہلو شاعری کا بھی ہے جس میں وہ ایک باصلاحیت شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے درجنوں نغمے، اقوال اور کتابیں تحریر کی ہیں ان کی نظموں کا مجموعہ My Journey کے نام سے انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ پہلے پہل یہ نظمیں تمل زبان میں لکھی گئی تھیں بعد میں ان نظموں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اردو میں شکیل شفائی نے 'میرا سفر' کے عنوان سے ان نظموں کا ترجمہ کیا جو پہلی بار 2004 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل 17 نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں خدا، پیغام، کائنات، بادل، خودداری، حافظہ، شکرانہ، تلاش مسرت، اخوت، والد والدہ، بچپن جیسے موضوعات پر ہیں۔ ان میں کوئی کوئی نظم تو کافی طویل ہے اور کئی کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ ان نظموں میں کلام صاحب کا ایک ایسا روپ سامنے آتا ہے جو عموماً سائنس داں یا سیاست سے وابستہ افراد کا نہیں ہوتا۔ انسانی اقدار اور انسانی وجود سے ان کی محبت ان نظموں میں بکھری پڑی ہے۔ حالانکہ عبدالکلام صاحب نے ساری نظمیں جنوبی ہند کے تناظر میں کہی ہیں لیکن یہ نظمیں ملک کے دیگر علاقوں اور تہذیبی ماحول کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ معروف نقاد پروفیسر قمر رئیس صاحب ان کی شاعری پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''ان نظموں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن ان میں شاعر کی زندگی کے باطنی منطقہ کے منظر صاف دکھائی دیتے ہیں اس شعری مجموعے کی تخلیقات ایک سائنس داں سے زیادہ ایک حساس دانشور کی زندگی کی روداد سناتی ہیں۔''

(میرا سفر، ص10)

ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کی شاعری میں فطرت کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ خلیل جبران سے بہت متاثر تھے اور ان کی شاعری پر بھی خلیل جبران کا واضح عکس نظر آتا ہے۔ خلیل جبران کی کتابوں 'دی پروفیٹ' اور بروکن ونگس، میررس آف دی سول، دی ویژن وغیرہ کی نظمیں آپ پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ عبدالکلام صاحب نے ضرور ان کتابوں سے استفادہ کیا ہوگا۔ عبدالکلام کی نظموں میں فطرت کے خوبصورت اور حسین مناظر ملیں گے۔ ساتھ ہی ان کی تخیل کی بلند پروازی من موہ لیتی ہے۔ ملاحظہ کریں نظم شکرانہ کا یہ بند:

پھلوں سے جھولتی شاخیں شجر کی
ثمر ان پر کچھ ایسے لد رہے تھے
ہوں جیسے ماں سے ہم آغوش بچے
(شکرانہ)

ایک دوسری نظم:

مجھے تکتی ہوئی ننھی گلہری
سنہری خوشنما چڑیا، چنبیلی پر
ہوئی تھی محو سرگوشی گلوں سے
(کائنات)

ان کی شاعری کی خوبصورتی جہاں متاثر کرتی ہے وہیں ہمیں حوصلہ دیتی ہے۔ ہمارے دلوں کو گرماتی ہے۔ قدرت کی صناعی کو دیکھنے کا ایک نظریہ پیش کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں خوبصورت تشبیہات واستعارے بکھرے پڑے ہیں۔

شعری مجموعہ 'میرا سفر' کی پہلی نظم اخوت ہے جس میں عبدالکلام صاحب اپنے بچپن کو یاد کرتے ہیں کہ کس طرح وہ اپنے گاؤں کے مکتب میں ایک برہمن لڑکے کے ہمراہ بیٹھتے تھے اور دونوں میں گہری دوستی تھی لیکن اچانک ایک استاد اسکول آتا ہے اور دونوں کو الگ کر دیتا ہے۔ شاید اسے ایک مسلمان کا برہمن کے ساتھ بیٹھنا ناگوار گزرا تھا۔ یہ دوستی کے جذبات سے آراستہ ایک عمدہ نظم ہے۔ نظم کا آخری بند ملاحظہ کریں:

مگر خیال جو رہ رہ کے اب بھی آتا ہے — کہ سانپ بن کر معلم کہاں سے آئے تھے
جدا کیا جنھوں نے۔ ہماری روحوں کو — یہ علم دیتے نہیں۔ نفرتیں سکھاتے ہیں
جسے نہ جوڑ سکیں اس کو توڑ دیتے ہیں — سنے نہ کوئی بے طلب نصیحت کو
ہر ایک بشر کو عطا کی گئی ہے آزادی — نگاہ رب میں مساوی ہے نسلِ انسانی

آپ سب جانتے ہیں کہ ملک کے کچھ اسکولوں اور مکتبوں میں کس طرح نفرتیں سکھائی جارہی ہیں۔ کتابوں میں ابواب تبدیل کیے جارہے ہیں۔ نظریات بدلے جارہے ہیں۔ اس نظم میں موجودہ حالات کی عکاسی بھی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ اسکول اور مدارس تعلیم حاصل کرنے کی مقدس جگہیں ہیں وہاں بھی اگر طلبا کے درمیان جانب داری برتی جائے گی تو پھر آنے والے دنوں میں ملک کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ نظم نہ صرف اخلاقیات کا درس دیتی ہے بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ملک کی ترقی محبت، اتحاد اور دوستی سے ہی ممکن ہے۔

نظم 'تلاش مسرت' میں انھوں نے اقبال کا انداز اپنایا ہے۔ 'پہاڑ اور گلہری'، 'شکوہ

جواب شکوہ کے انداز میں یہ نظم تحریر کی گئی ہے جس میں پھولوں کا ایک کنبہ آپس میں سوال وجواب کر رہا ہے کہ ہم کیوں کھلتے ہیں۔ ہمارے کھلنے کا مقصد کیا ہے۔ انسان تو ہمیں روند دیتا ہے، توڑ لیتا ہے، گل نوخیز اور مادرِ گل کے سوال جواب بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ مادرِ گل کا جواب کچھ یوں ہوتا ہے:

کہا ماں نے نہ ہو مایوس بچو!

ہمارا فرض ہے تعمیر فطرت — اور اس کا بخت ہے تخریب کاری
مبلغ ہم ہیں پیغام خدا کے — اگرچہ اشرف المخلوق یہ ہے
یہی ہے حکم ربی — وہ ہم سے فیض اٹھائے
گلوں سے گھر سجائے

خداؤں، دیوتاؤں پر چڑھائے — بنا کر ہار محبوبہ کے جوڑے میں سجائے
ہمارے لمس سے وہ رحم دل ہو — اسے حاصل ہو عرفانِ لطافت
شرافت عاجزی، خوئے متانت

اگر جوبن کبھی آئے نہ ہم پر — یہ ہو جائے درندے سے بھی بدتر
مٹا ڈالے گا یہ دنیا کی خوشیاں — خدا نے جو عطا کی ہیں جہاں کو

لہٰذا اے میرے بچو!

چھپا کر درد محرومی کا دل میں — ہمیں کھلنا ہے اس انساں کی خاطر
کہ ہو یہ دردمند و مہرباں کامل — متاعِ عافیت ہو اُس کا حاصل

عام فہم الفاظ اور انداز میں لکھی یہ نظم ہمیں فطرت سے محبت کرنے اور درختوں، پھولوں پھلوں کو برباد نہ کرنے کا درس دیتی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ آج جنگلات کی کٹائی سے ماحول کس قدر آلودہ ہوتا جا رہا ہے اور صاف ہوا میں سانس لینا بھی مشکل ہے۔ مادر گل اور نوخیز گل کی سرگوشی کو کتنے خوبصورت اور متاثر کن انداز میں کلام صاحب نے بیان کیا ہے۔

اپنی نظموں میں عبدالکلام ایک درد بھرے دل والے جذباتی شخص نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں انسان دوستی، حساسیت، مایوسی، ناامیدی اور دنیا جہاں کے مسائل بکھرے ہیں، ساتھ ہی ان مسائل کا حل بھی ہے۔ اپنی نظموں میں انھوں نے فطرت اور قدرت سے محبت کرنے کا واضح پیغام دیا ہے۔ انسانوں سے بھری اس دنیا میں فتنہ وفساد سے وہ نالاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا میں امن وسکون قائم ہو جائے اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں۔ مذہب کی بنیاد پر تو کبھی بھی انسانوں کو نہیں بانٹنا چاہیے۔ ان کا نظریہ تھا کہ خدا ایک ہے اور سارے انسان چاہے وہ کسی بھی مذہب کو مانتے ہوں خدا کے بندے ہیں۔ لیکن دنیا میں ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی جیسے مذاہب میں تقسیم لوگ ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے ہیں۔ جب لوگوں پر مشکل وقت آتا ہے تو لوگ اللہ کے پاس جاتے ہی اور پھر خدا انھیں یوں جواب دیتا ہے:

مرا خدا ہے یہ، بھگوان یہ تو، میرا ہے — پکار اٹھی تھیں روحیں، خدا کو غیظ آیا
نہیں کسی کا نہیں میں، کہ تم درندے ہو — مجھے ہی رام، رحیم اور خدا میں بانٹ دیا
میرا سکون میرا چین تم نے چھین لیا — کیا ہے قید مجھے دھرم کے شکنجے میں
تو پھر رہو یونہی بربادیوں کے پنجے میں — کہا تھا میں نے کہ خیمے لگاؤ الفت کے
پڑاؤ ڈال دیئے تم نے جا کے نفرت کے — بنایا میں نے ہے اور آج کہہ رہے ہو تم
کہ وہ رحیم کے ہیں، ہم ہیں رام کے بندے
میرے بنائے ہوئے بھی نہیں رہے میرے

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بعد میں خدا کو اپنے بندوں پر رحم آ جاتا ہے اور وہ اپنے بندوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

خدا کے غیظ وغضب کو یہ سارے سنتے رہے — اور اپنے کردہ گناہوں پہ شرمسار ہوئے
پھر آیا رحم خدا کو تو اس نے سمجھایا — اُسی زمین پہ جاؤ، وہیں دوبارہ جاؤ
پیام، امن و محبت کا پھر سے پھیلاؤ — خدا کا مان لیا حکم اور اس کے بعد
ہوا بصورتِ اعجاز یوں نزول ان کا
زمین کی گود میں معصوم سا تھا ایک بچہ

اور اس طرح نظم کا اختتام ہوتا ہے۔ یہاں دو باتیں قابل ذکر ہیں کہ ہم انسان اپنے مذہب کو اچھا کہتے ہیں اور دوسرے کو برا۔ مذہب کے نام پر خون بہتے ہیں لیکن مشکل میں اسی خدا کے پاس جاتے ہیں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور جو سارے مذاہب کے لیے برابر ہے اور ایک ہی نظر سے سب کو دیکھتا ہے۔ دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ ''زمین کی گود میں معصوم سا تھا ایک بچہ۔ اس مصرع میں بہت سارے سوالات کا جواب ہے۔ ایک بچہ معصوم اور پھول کے جیسا ہوتا ہے، اسے مذہب سے یا دنیا کے مسائل سے کچھ نہیں لینا دینا۔ جو بھی اس کی طرف محبت سے ہاتھ بڑھاتا ہے وہ اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ وہ مسکراہٹ کا مسکراہٹ سے جواب دیتا ہے۔ اُسے نہ ہندو کا پتہ ہے نہ مسلم کا علم۔ کیا ہم سب انسان اس بچے کی طرح ہنسی خوشی مل جل کر نہیں رہ سکتے

ان کی نظموں میں پوکھروں میں کھلے سوسن کے پھول، حیران نگاہوں سے تکتی ہوئی گلہری، چنبیلی پر سنہری چڑیا، جنگلی جھاڑیوں پر کھلے پھول اور انھیں گرد میں اَٹے بچوں سے تشبیہ دینا، رنجیدہ فلک پر پرزہ پرزہ پھیلے بادل، حواس باختہ ویران گلی محلے گھر، ہوائے لمس سے، شاخوں سے چھن کے آتی رہے دھوپ، جہاں گلوں کی مہک ہے، پیام ربانی، فضا میں اڑتے ہوئے طائران خوش الحان، روپہلے جھاگ، ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر جائیں ٹوٹ، جیسے خوبصورت پیکر ان کی نظموں کو ایک الگ ہی حسن عطا کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں پھول، فضا، کائنات اور بچے تو ہیں ہی ساتھ ہی اپنی ذات میں کھو جانے، اپنی شخصیت کا ادراک کرنے اور خود کو ایک بہتر انسان بنانے کا پیغام بھی ہے۔ عبدالکلام جانتے ہیں کہ ایک بہتر اور مثالی معاشرہ تب ہی تشکیل دیا جا سکتا ہے جب ہر انسان اپنی اپنی سطح پر کوشش کرے گا۔ انسان دوسروں کو برا کہہ دیتا ہے لیکن اپنے اندرون میں جھانک کر نہیں دیکھتا کہ وہ خود کیسا ہے۔ وہ ایک بچے کو سب سے زیادہ معصوم اور اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے والد کی کشتی اور ان کی محبت کو یاد کرتے ہیں کہ وہ کتنی محنت سے کشتی بناتے تھے اور ان کے سارے کنبے کا پیٹ پلتا تھا۔ اس کی خوبصورتی آج کے مشینی جہاز سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے پانی پر چلنے سے مچھلیاں خوش ہوتی تھیں جبکہ آج کے مشینی جہازوں سے مچھلیاں اور دوسری مخلوقات ڈر کر دور بھاگ جاتی ہیں۔ ان کی نظموں میں خدا سے محبت، قدرت سے محبت، فطرت سے محبت اور خدا کے بندوں سے محبت کا پیغام بھرا ہوا ہے۔ وہ ملک میں امن وشانتی اور اتحاد واتفاق چاہتے ہیں۔ ان کی نظم 'دیوار سنگ' کے آخری حصے پر میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں:

ہو میرے گرد مرے خواب کی حسیں تعبیر — ہے میرا خواب فرازِ وطن، فراز زمیں
سکون، امن ومحبت رہیں یہاں پہ مکیں — تو اب بتاؤ یہ دیوارِ سنگ کیوں اٹھے

☆☆☆

ڈاکٹر خالد اشرف

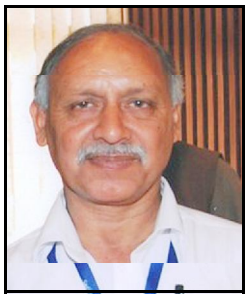

فہمیدہ ریاض کی احتجاجی شاعری

مملکتِ خداداد پاکستان کا قیام دوقومی نظریے کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ خیری برادران، چودھری رحمت علی اور علامہ اقبال کے ذہنوں سے گزرتا ہوا یہ نظریہ 23 مارچ 1940 کو قائداعظم محمد علی جناح کے مطابق پاکستان کی شکل میں سڑکوں بازاروں، گاؤں، شہروں، گلیوں اور محلّوں میں وسعت پا تا چلا گیا۔ اور بالآخر 14 اگست 1947 کو اپنی جغرافیائی شکل میں وجود میں آیا۔ اگست 1947 کو قائداعظم نے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی میں تقریر کی تھی جس میں پاکستان کے سبھی ہندو، مسلمان، سکھوں اور عیسائیوں کو یکساں شہری و آئینی حقوق دیئے جانے کا وعدہ کیا تھا جو پورا نہیں کیا گیا۔ زاہدہ حنا کے مطابق اس تقریر میں پاکستان کی خواتین کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا تھا۔ پھر 12 مارچ 1949 کو دستور ساز اسمبلی میں مملکتِ اسلامی پاکستان کی قرردادِ مقاصد منظور کی گئی جس میں اسلامی اصولوں کے تحت جمہوریت، مساوات اور عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور ہر شہری کو بلالحاظِ مذہب وملت تمام جائز حقوق دینے کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ لیکن مذہبی اقلیتوں اور عورتوں کو عملی طور پر مساوی حقوق نہیں دیئے گئے اور پاکستانی معاشرے میں مذہبی وصنفی عدم مساوات کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ 1956 میں پاکستان کا پہلا آئین مرتب ہوا جس کے تحت وہاں کی خواتین کو مخصوص نشستوں اور عام اسمبلی نشستوں، دونوں کے لیے ووٹ ڈالنے کے حقوق حاصل ہوئے۔ جنرل ایوب کے زمانے میں 1961 میں خواتین کے عائلی امور میں کچھ ترقی پسندانہ قوانین تشکیل ہوئے لیکن زیادہ تر پر جاگیرداروں اور مولویوں کی مخالفت کی بنا پر عمل نہ ہوسکا۔ 1972 میں ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار میں نیا آئین لاگو ہوا جس میں خواتین کے مساوی حقوق کا اعادہ کیا گیا تھا۔ لیکن جولائی 1977 میں جنرل ضیاء الحق کے ذریعے فوجی حکومت قائم کرنے کے بعد اور پھر نام نہاد نظامِ مصطفیٰ کی تاسیس کے نام پر ملک میں قدامت پرستی کا عروج ہوا اور خواتین کو جو تھوڑے بہت حقوق حاصل ہوئے تھے، وہ بھی غصب کر لیے گئے۔ خواتین کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا یا انہیں خاموش رہنے پر مجبور کیا گیا۔ ظلم وجبر کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

تشکیلِ پاکستان کے ابتدائی دس، بارہ سال خوش امیدی اور جذبۂ ملی کی سرشاری کے تھے۔ لیکن 1960 تک آتے آتے ایک طرف ترقی پسندی کی لے دھیمی پڑنے لگی تو دوسری طرف ملک میں فوجی آمریت کا پیدا کردہ خوف اور جبر پوری قوم میں اپنی بے وقعتی اور بے سمتی کا منفی احساس پیدا کرنے لگا۔ ہندوستان اور پاکستان میں یہ زمانہ آزادی سے قبل کے دیکھے گئے سنہرے خوابوں کے ٹوٹنے اور پرانے آدرشوں کے کھوکھلے ثابت ہونے کا زمانہ تھا۔ اسی اجتماعی مایوسی اور لاسمتیت نے جدید اردو شاعری کو پروان چڑھایا، جس کی کلیدی علامات ہی اندھیرا، قید، رات، کیچڑ، تنہائی، کنواں، دلدل، پت جھڑ، کالی آندھی، خودکشی، اور سر بریدہ جسم وغیرہ بن گئی تھیں۔

اسی مایوسی، سیاسی جبر اور شکستگی کے اندھیروں کے درمیان پاکستان میں احتجاجی ادب کا رجحان وجود میں آنے لگا۔ فیض احمد فیض 1952 ہی میں نظم 'صبحِ آزادی' لکھ کر قومی شکست خوردگی اور غیر روشن مستقبل کی نشان دہی کر چکے تھے اور قرۃ العین حیدر اپنے ناول 'آگ کا دریا' کے اواخر میں اور شوکت صدیقی 'خدا کی بستی' میں 1960 کے آس پاس ایک عام مایوسی اور انسانوں کی بے قدری کا اظہار کر چکے تھے، لیکن شاعری میں سیاسی وسماجی نوعیت کا اظہار ذرا بعد میں ہوا اور یہ اظہار فیض کے ترقی پسندانہ ڈکشن سے کافی مختلف تھا، بلکہ ن۔م راشد کے تہہ دار لہجے کے نزدیک تر تھا۔

پاکستان کی اردو شاعری میں فیض کے بعد جن شاعروں نے اپنی شناخت درج کرائی، ان میں ظفر اقبال، اطہر نفیس، احمد فراز، مجید امجد، شہزاد احمد، سلیم احمد، قیوم نظر، یوسف ظفر، ساقی فاروقی، افتخار عارف، حامد عزیز مدنی اور حبیب جالب وغیرہ کو زیادہ قبولیت حاصل ہوئی۔ 1960 کے بعد منظرِ عام پر آنے والی اس نسل کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، زہرا نگاہ، پروین شاکر، عذرا عباس، نسرین انجم بھٹی اور نسیم سید جیسی بے خوف خواتین کا ایک گروپ سامنے آیا جنھوں نے زیادہ تر نظم کو ذریعۂ اظہار بنایا اور پاکستان کے پابند معاشرے میں جاری عورتوں کے استحصال اور ان کے ساتھ عدم مساوات کے برتاؤ کے خلاف آواز اٹھائی اور کئی قسم کے نقصانات بھی برداشت کیے۔

☆

پاکستان میں فوجی حکومتوں اور مذہبی جنونیوں کے ہاتھوں نقصانات اٹھانے والے شاعروں اور ادیبوں میں فیض احمد فیض، حبیب جالب، احمد فراز، فخر زماں اور مسعود اشعر وغیرہ مردوں کے علاوہ خواتین میں فہمیدہ ریاض اور زاہدہ حنا کے نام سرِ فہرست ہیں۔

فہمیدہ ریاض کی پیدائش 1945 میں میرٹھ میں ہوئی تھی۔ لیکن ان کا کنبہ پہلے ہی سے حیدرآباد (سندھ) میں آباد تھا جس وقت وہ سندھ یونیورسٹی سے گریجویشن کر رہی تھیں، فیض احمد فیض راولپنڈی سازش کیس میں اسیر تھے اور نوجوان نسل کے ہیرو بن چکے تھے۔ حالانکہ 1954 میں پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو غیر

شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، یونیورسٹی آف دہلی، دہلی۔ 110007
فون: 08800489012 khaliddu@gmail.com

قانونی قرار دیا جاچکا تھا، لیکن بہت سے سوشلسٹ ادیب، شاعر اور فنکار ٹریڈ یونین، اخبارات، ریڈیو اور تعلیمی اداروں میں کام کر رہے تھے۔ قوم اور عقیدے کے نام پر تشکیل دی گئی مملکتِ پاکستان میں جب اشتراکیت اور سوشلزم کی ترویج و اشاعت جرم قرار پائی تو روشن خیال دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں نے علامت اور اسطور میں طبع آزمائی کی۔

فہمیدہ ریاض کے پہلے شعری مجموعے 'پتھر کی زبان' (1967) کی نظمیں ایک دوشیزہ کے رومانوی احساس سے پُر ہیں۔ پروین شاکر اور احمد فراز کے ابتدائی مجموعوں کی طرح یہ نظمیں ٹین ایج کے نرم لہجے اور لطیف احساسات سے آراستہ ہیں۔ لیکن دوسرا مجموعہ 'بدن دریدہ' (1973) نہ صرف فہمیدہ ریاض کے لیے بلکہ تمام نسائی شاعری کے لیے بڑا ہنگامہ خیز اور متنازعہ ثابت ہوا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے 'بدن دریدہ' کی اشاعت کے بعد پیدا شدہ شور شرابے کے بارے میں لکھا تھا:

''فہمیدہ کی 'بدن دریدہ' نے جو غدر مچایا اس کے نتیجے میں وہ بے ضرر شاعرات کے جھرمٹ میں منفرد ہو کر متنازعہ شخصیت بن گئی۔ طہارت پسندوں کی مطعون، اخلاق پرستوں کی معتوب، سچے قارئین کی محبوب، فہمیدہ ریاض معاصر شعراء میں ایک معتبر نام قرار پائی۔ ابھی نزاعات کی گونج کم نہ ہوئی تھی کہ اپنے عصر سے اس کے کمٹ منٹ کا اظہار ایسی نظموں کی صورت میں ہوا، جن میں الفاظ کی جگہ گویا کیکٹس استعمال کے گئے تھے۔ اور یوں نزاعات کی شدت اور آراء کی تلخی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ فہمیدہ ریاض یقیناً مضبوط اعصاب کی عورت ہے جو یہ سب سہہ گئی''۔

(گرد پوش کی تحریر: میں مٹی مورت ہوں (کلیات)، لاہور، 2013)

'بدن دریدہ' کی اشاعت پر قدامت پرستوں کے حلقے سے جو شور و غوغا فہمیدہ ریاض کی ذات کے خلاف بلند ہوا اس کی بنیاد میں چند جنسی نوعیت کی نظمیں: 'بھیگی کالی رات کی بیٹی، باکرہ، لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا' کب تک 'بدن دریدہ' زبانوں کا بوسہ' وہ ایک زن ناپاک ہے' اور پہلی بار' شامل تھیں۔ جن میں گوشت پوست کی ایک مکمل عورت کے مرد کے ساتھ مل کر ایک جنسی وحدت قائم کرنے اور اس کے نتیجے میں وجود میں آنے والی ایک تازہ مخلوق کا استقبال کرنے کے تصورات کو بڑے بے جھجک الفاظ میں پیش کیا گیا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک یہی آزاد خیال نظمیں فہمیدہ ریاض کی نسائی شاعری کی پہچان رہیں اور اس بے باک لہجے نے ان کو مملکتِ خداداد کے ثقہ و پابندِ شرع گروہوں کے لیے ناپسندیدہ عورت بنا دیا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ ناپسندیدگی اور مخالفت فہمیدہ ریاض کے حصے میں اُس وقت آنی شروع ہوئی جب وہ سیاسی و احتجاجی نظمیں کہنے لگیں۔ انُ کے اولین مجموعے کو ایک نوجوان شاعرہ کے رومانوی احساس کا اظہار قرار دیا گیا، حالانکہ اس مجموعے (پتھر کی زبان) میں ایک دو نظمیں (زادِ راہ' اور 'لمبے سفر کی منزل') کچھ مزاحمتی / احتجاجی تیور کی غمازی کرتی تھیں۔ 'بدن دریدہ' (1973) پر تقریباً وہی الزام لگائے گئے جو عصمت چغتائی پر 'لحاف' کی اشاعت (1943) کے بعد لگائے گئے تھے۔ لیکن ابھی تک فہمیدہ ریاض ریاستی جبر و تعذیب سے محفوظ تھیں۔ جس کا شکار فیض احمد فیض، حبیب جالب، ابراہیم جلیس، احمد ندیم قاسمی، عبداللہ ملک، ممتاز حسین، سبط حسن، ظہیر کاشمیری، حسن عابدی، سجاد ظہیر، حمید اختر اور سبط اختر وغیرہ 1950 کے بعد ہو چکے تھے۔ یہ زمانہ لیاقت علی خاں سے جنرل ایوب خاں تک کا تھا:

'بدن دریدہ' کا غالب لہجہ مشرقی عورت کی جنسی نفسیات کے اعلان پر مبنی تھا۔ لیکن اس مجموعے کی نظموں کا دوسرا آہنگ سیاسی بھی تھا جس کا اظہار خود فہمیدہ ریاض نے اس کتاب کے دیباچے میں کیا تھا:

''کارگاہِ ہستی میں کس حساس ذی روح پر وہ مقام نہیں آیا ہوگا، جب اُس نے خود کو مقتل کے دروازے پر نہ پایا ہو، جب اسے اپنے وجود کی قیمت نقدِ جاں سے نہ چکانی پڑی ہو؟ لیکن جب جان سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جھکا کر کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنا دیں، آخری سانس تک جنگ کریں؟ سو میں نے بھی اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں پائی۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں، ایک رجز ہیں جنہیں بلند آواز سے پڑھتی ہوئی میں اپنے مقتل سے گزری۔ اس لحاظ سے 'بدن دریدہ' ایک رزمیہ ہے''۔

(فہمیدہ ریاض: میں مٹی کی مورت ہوں' لاہور، 2013، ص93)

اپنے اسی احتجاجی تیور کے تخلیقی اظہار کے طور پر فہمیدہ ریاض نے 'بدن دریدہ' میں آڈن کے نام، شہر والوسنو، اور '23 مارچ 1973' وغیرہ سیاسی و مزاحمتی نوعیت کی نظمیں کہیں۔ اول الذکر نظم میں برطانوی' امریکی شاعر W.H.AUDEN کی وفات 1973 کے حوالے سے شاعرہ کہتی ہے:

''جھوٹ جیتا ہے/ کہ نفرت امر ہے/ کہ طاقت ہے برحق
کہ سچ ہارتا ہے/ کہ شیطان نیکی کے احمق خدا سے بڑا ہے''

(نظم آڈن کے نام، میں مٹی کی مورت ہوں، لاہور، 2013، ص123)

دوسری نظم بعنوان 'شہر والوسنو' میں ایک ایسی مملکت کی تصویر کشی کی گئی ہے جہاں کے انسانوں پر جانوروں کی حکومت ہے اور جہاں کے دانش ور بیمار اور مردہ ہو چکے تھے یا اہل اقتدار کے حاشیہ بردار بن چکے تھے:

کچھ عجب اہلِ فن بھی تو تھے اُس جگہ — سامری سحر سے روگ میں مبتلا
خلعتِ شاہ تھی ان کی واحد دوا — بیشتر قابِ سلطان کے خوشہ چیں
گیت لکھتے رہے گیت گاتے رہے — عہدِ زریں کے ڈنکے بجاتے رہے

(نظم: شہر والوسنو، میں مٹی کی مورت ہوں، ص182)

پاکستان میں یہ زمانہ ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوری حکومت کا زمانہ تھا۔ لیکن بھٹو شاہی میں جاگیرداروں اور وڈیروں کا ایک گروہ ایسا شامل ہو گیا تھا جو کسانوں، اقلیتوں اور مزدوروں پر اُسی نوعیت کے مظالم جاری رکھے ہوئے تھا، جو جنرل ایوب اور جنرل یحییٰ خاں کی فوجی حکومتوں میں روا تھے۔ جب 1972 میں بھٹو حکومت کی سرپرستی میں سندھ حکومت نے سندھی زبان کو صوبائی زبان بنانے کا فیصلہ کیا تو اردو بولنے والے مہاجرین نے اس اقدام کی مخالفت کی۔ چنانچہ اردو کو بھی صوبۂ سندھ کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔

حالانکہ بھٹو حکومت ایک جمہوری عمل کے تحت تشکیل ہوئی تھی لیکن اپنے سیاسی مخالفین کو زیر کرنے کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ پولیس اور فوج پر انحصار کر رہی تھی۔ جب یوم پاکستان کے موقعے پر 23 مارچ 1973 کو راولپنڈی میں حزبِ اختلاف کے جلسے پر چار گھنٹے فائرنگ ہوئی تو فہمیدہ ریاض خاموش نہ رہ سکیں اور انہوں نے کہا:

پیرہن چاک کرو مصلحت اندیشی کا — اپنے اشکوں کی برستی ہوئی بوچھار میں آؤ
یہ جھجکتے ہوئے بازو تو ہوا میں لہراؤ — جسم کو رقص کے گرداب میں چکرانے دو

شہر در شہر جو ہم رقص میں لہرائیں گے حلقہ در حلقہ بھنور پڑتے چلے جائیں گے
جسم و جاں رقص کریں نطق و زباں رقص کریں تلملاتا ہے لہو آج مری رگ رگ میں

(نظم :23 مارچ 1973 'میں مٹی کی مورت ہوں' ص 192)

بھٹو شاہی کے ہی زمانے میں فہمیدہ ریاض کا تیسرا مجموعہ 'دھوپ' (1975) شائع ہوا تھا۔ اگست 1973 میں ذوالفقار علی بھٹو نے نئے آئین کے تحت صدارت کا عہدہ چھوڑ کر وزیراعظم کا زیادہ طاقت ور عہدہ حاصل کر لیا تھا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ بھی اپنے قبضے میں رکھا۔ انہوں نے فوج کا سربراہ جنرل ٹکا خان کو بنایا جس نے بنگلہ دیش میں ہزاروں بنگالیوں کو قتل کرایا تھا اور عورتوں کو بے حرمت کرایا تھا۔ مارچ 1973 میں پاکستانی فوج کے چند افسران نے بھٹو حکومت کا تختہ پلٹنے کی کوشش کی اور گرفتار ہوئے۔ اُن کو جس فوجی عدالت نے سزا دی تھی اس کا سربراہ بریگیڈیر ضیاء الحق تھا۔ ضیاء الحق، ذوالفقار علی بھٹو کی خوشامدیں کر کر کے فوج کے سربراہ کے عہدے تک پہنچا، مگر اپریل 1979 میں ایک جعلی مقدمے میں بھٹو کو پھنسا کر ان کی پھانسی کا محرک اور اسلامی شریعت کا خودساختہ محافظ بنا۔

فروری 1974 میں لاہور میں بھٹو صاحب نے اسلامی ممالک کے سربراہوں کی ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد کی اور ایک مسلم ہیرو کا امیج بنانے لگے، جب کہ اپنے الیکشن پروگراموں میں انہوں نے سوشلزم کا نعرہ بلند کیا تھا۔ یہی نہیں، بھٹو نے اپنے پرانے وفاداروں: احمد رضا قصوری، جے اے رحیم، معراج محمد خاں، طفیل عباس، حسین نقی، مختار رانا، غلام مصطفیٰ کھر اور حنیف رامے وغیرہ کو طرح طرح سے بے عزت کیا، کراچی میں مزدوروں پر گولی چلوائی اور بلوچستان میں باقاعدہ فوج کشی کی تو وہ ایک سفاک اور کینہ پرور زمیندار کی شکل اختیار کر گئے اور اپنے پرائے سبھی اُن سے دور ہوتے چلے گئے۔ پھر بھٹو صاحب نے اپنی بیگم نصرت بھٹو کو پیپلز پارٹی کی صدارت کی کرسی دے دی تو ڈاکٹر مبشر حسن اور غلام مصطفیٰ جتوئی جیسے سینئر لیڈر پارٹی سے کنارہ کش ہو گئے اور پیپلز پارٹی بھٹو گھرانے کی جاگیر بن کر رہ گئی۔ مارچ 1973 میں خاں عبدالولی خاں کی نیشنل عوامی پارٹی کے اجلاس بمقام راولپنڈی میں بھٹو حکومت کی ایماء پر فائرنگ کی گئی اور بہت سے پختون مارے گئے، پھر فروری 1975 میں حیات محمد خاں شیرپاؤ کے قتل میں خاں ولی خاں کو ملوث کیا گیا اور ان کے ساتھ ساتھ حبیب جالب اور بلوچ انقلابی شاعر گل خاں نصیر پر غداری کے مقدمے قائم کیے گئے تو بھٹو حکومت کے جمہوری نعروں کا کھوکھلا پن یکسر واضح ہو گیا تھا۔

ان نام نہاد جمہوری تبدیلیوں اور سیاسی و جاگیردارانہ سازشوں کا مشاہدہ فہمیدہ ریاض نے کراچی کے تناظر میں کیا اور اپنی تخلیقی راہ متعین کی۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان کے دانشوروں، ادیبوں اور فنکاروں نے بھٹو حکومت کو عموماً خوش آمدید کہا تھا، لیکن جب سماجی اور معاشی سطح پر حالات میں کوئی تبدیلی سامنے نہیں آئی تو زیادہ تر روشن خیال اور ترقی پسند ادیب و دانشور بھٹو حکومت سے بددل ہو گئے۔ پھر جب بھٹو حکومت نے مارچ 1977 کے پارلیمانی الیکشن میں دھاندلی مچا کر تین چوتھائی سے زیادہ نشستیں حاصل کیں تو ملک میں گویا کہرام مچ گیا۔ بھٹو نے مخالفین کو خوش کرنے کے لیے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے ڈالا، اتوار کے بجائے جمعہ کی عام تعطیل کر دی، چھ ماہ کے اندر تمام قوانین کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کا وعدہ کر لیا، خود مولانا مودودی کو منانے کے لیے جماعت اسلامی کے ہیڈکوارٹر میں حاضری بھی دے آئے۔ لیکن مغربی سامراج ان کی قسمت کا فیصلہ کر چکا تھا۔

چنانچہ 5 جولائی 1977 کو جنرل ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کو گرفتار کر کے جعلی قسم کا نظامِ مصطفیٰ قائم کر دیا اور 4 اپریل 1979 کو ان کو پھانسی دے کر اپنا اقتدار مستحکم کر لیا۔

فہمیدہ ریاض نے اس تمام اتھل پتھل کو نہ صرف جاگتی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا بلکہ اس کے خلاف احتجاج بھی کیا۔ مثلاً یوم پاکستان کے موقع پر انہوں نے ایک نظم '23 مارچ 1974' کہی جس میں وہ مجموعی دہشت اور خوف کی فضا کی عکاسی کرتے ہوئے کہتی ہیں:

چار سُو ہے بڑی وحشت کا سماں کسی آسیب کا سایہ ہے یہاں
کوئی آواز سی ہے فاتحہ خواں شہر کا شہر بنا گورستاں

(23 مارچ 1974: میں مٹی کی مورت ہوں، لاہور، 2013، ص 244)

جب مشرقی پاکستان میں 1970 میں بنگالیوں کے خلاف آرمی ایکشن ہوا تو مذہبی حلقوں اور جاگیرداروں نے اس کی حمایت کی۔ لیکن احمد فراز، حبیب جالب اور حمایت علی وغیرہ نے بنگالی عوام پر ہونے والے مظالم اور ان کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجی نظمیں کہیں۔ جب افواج نے اپنے ہی ملک کے مشرقی حلقے میں عوام پر ظلم و تشدد کا بازار گرم کیا تو فہمیدہ ریاض نے کہا:

سب چپ چاپ کریں تماشا اور چپ چاپ سنیں کہانی
پھر فوج کے بوٹ تلے ہے پورب کی گھائل دھرتی
اور دیس کے سب چوروں کو ان پٹے ہوئے مہروں کو
پھر جشن مناتے دیکھیں شہنائی بجاتے دیکھیں

(اکیلا کمرہ: میں مٹی کی مورت ہوں، ص 248)

فہمیدہ ریاض مہاجر بنام سندھی قومیت کی بحث میں انُ دبے کچلے سندھی عوام کی ہمنوا تھیں جن کا معاشی استحصال مہاجر تاجروں، اردو بولنے والے افسروں اور سندھی، بلوچی جاگیرداروں نے مل کر کیا تھا، یہاں تک کہ عروس البلاد کراچی کے مال و دولت اور چمک دمک میں غریب سندھیوں کو کوئی شرکت نہیں دی گئی تھی۔ لیکن بھٹو شاہی کے دور میں سندھیوں کو اور ان کی زبان کو چند مراعات ملیں تو اردو بولنے والے مہاجرین نے ان مراعات کی مخالفت کی۔ فہمیدہ ریاض نے طبقۂ مہاجرین کی لسانی شدت پسندی پر تنقید کرتے ہوئے مجموعہ 'دھوپ' کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

''ہماری بولی کے ساتھ المیہ یہ ہوا ہے کہ ہجرت کے باعث ہماری طرح یہ زبان (اردو) بھی کلچر کے اصل خالق، یعنی اپنے کسان طبقے سے کٹ گئی ہے۔ اس لئے ہماری بولی سیاسی مصلحتوں کے Dehumanising عمل کا اس بری طرح شکار ہوئی ہے کہ مصنوعی قدغنوں نے اس کا خون سکھا ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصے سے دوسری بولیوں کے ادیب دبی زبان سے کہنے لگے ہیں کہ اس بولی میں آدمی کے اصلی، کچے اور گرم جذبات کا اظہار کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ لیکن جس زبان (اردو) پر وہ ایسا تبصرہ کرتے ہیں، وہ ہماری پوری ساری زبان نہیں، بلکہ درحقیقت ہماری بولی کی ایک طبقاتی شکل ہے''۔

(میں مٹی کی مورت ہوں، لاہور، 2013 'ص 223)

انہی خیالات کی عکاسی انہوں نے اپنی نظموں 'مہاجر' کافر ہیں' سندھ' اور جاپ' وغیرہ میں بھی کی ہے، جہاں وہ سندھ کی قدیم زمینی ثقافت، زبان اور موسموں کو اپنی

شاعری میں سمونے کی کوشش کرتی ہیں اور اس زمینی ثقافت کا کوئی تعلق عربی، فارسی تصورات وشعریات سے نہیں ہے۔

فہمیدہ ریاض کا چوتھا شعری مجموعہ 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے' پاکستانی تاریخ کے بدترین دور میں 1981 میں شائع ہوا تھا۔ ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے جبر وتشدد سے ہراساں ہوکر فیض احمد فیض ماسکو، لندن اور بیروت وغیرہ میں دربدری جھیل رہے تھے۔ احمد فراز کبھی لندن، کبھی ہندوستان میں پناہ گیر رہے، کبھی اٹک کے قلعہ میں قید رہے اور صرف حبیب جالب تھے جو جیل جاتے اور پولیس کی لاٹھیاں کھاتے رہے:

بڑے بنے تھے جالبؔ صاحب پٹے سڑک کے بیچ
گولی کھائی لاٹھی کھائی گرے سڑک کے بیچ
کبھی گریباں چاک ہوا اور کبھی ہوا دل خون
ہمیں تو یوں ہی ملے سخن کے صلے سڑک کے بیچ

جنرل ضیاء الحق نے 5 جولائی 1977 کی صبح وزیر اعظم بھٹو کو گرفتار کر کے 1973 کا آئین معطل کر دیا تھا اور بدترین قسم کی آمریت قائم کی۔ 1979 میں مردوں کو کھڑا کر کے اور عورتوں کو بٹھا کر کوڑے مارنے کی اسلامی سزا کا آرڈیننس جاری کیا گیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹوں کے مطابق 1980 سے پاکستان میں سیاسی کارکن عورتوں کو برسر عام اور حوالات یا جیل میں بدترین جسمانی اذیتیں دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ نواب پور، قصو، ملتان، خان پور وغیرہ شہروں میں عورتوں کو گھروں سے نکال کر بے لباس کیا گیا اور گلیوں میں پھرایا گیا۔ 1979 میں حدود آرڈیننس بھی جاری ہوا جس کے تحت زانی مرد اور زنا بالجبر کی شکار عورت بھی زنا کی ذمہ دار قرار پاتی ہے۔ 1979 ہی میں عورتوں کی نصف گواہی کی تجویز رکھی گئی جو منظور نہ ہونے کے باوجود قائم رہی۔

(بحوالہ زاہدہ حنا: عورت۔ زندگی کا زنداں، دہلی 2006، باب 3)

جنرل ضیاء الحق کے دور میں فہمیدہ ریاض اور ان کے کنبے کے خلاف دو وجوہ سے ظالمانہ کارروائیاں کی گئیں۔ اول ان کے خاتون ہونے کی بنا پر اور دوئم ان کے روشن خیال نظریات کی بنا پر۔ انہوں نے مارشل لاء کے اندھیرے میں جمہوریت کے فروغ کے لیے رسالہ 'آواز' جاری کیا۔ لیکن چار سال تک نکلنے کے بعد اس پر مارچ 1981 میں پابندی عائد کر دی گئی۔ اس رسالے پر فوجی حکومت نے فحاشی سے لے کر غداری تک کے چودہ مقدمے قائم کیے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے شوہر کو گرفتار کیا گیا۔ بالآخر وہ ایک مشاعرے کے بہانے سے ہندوستان آ گئیں۔ یہاں اندرا گاندھی کی حکومت نے ان کو پناہ دی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اور انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ وغیرہ نے ان کو روزگار فراہم کیا۔ یہ اس بنا پر ممکن ہو سکا کہ ہندوستان میں اُس زمانے میں ترقی پسند اور روشن خیال گروپ کافی با اثر تھے۔ ہندوستان میں انہوں نے 'Muslim Women Since 1857' کے موضوع پر ریسرچ پروجیکٹ کیا اور انگریزی میں ایک کتاب بھی 'Pakistan: Literature and Society' کے عنوان سے لکھی جو 1985 میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔

1981 میں فہمیدہ ریاض کی طویل نظم 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے' ایک مجموعے کی شکل میں شائع ہوئی جو پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ اس مجموعے میں عدالتوں میں جھوٹے مقدمے بھگتنے اور رات دن پولیس کے چھاپوں اور حوالات وجیل جانے کی سر پر لٹکتی ہوئی تلواروں کی تمام تلخی اور احتجاجی لفظیات نمایاں ہیں۔ اس مجموعے کے تعلق سے یہ بات بھی اہم ہے کہ وطن میں فوجی حکومت کی عائد کردہ پابندیوں سے مجبور ہو کر 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے' کو مصنفہ نے پہلے ہندوستان میں شائع کرایا تھا۔ مجموعے کے دوسرے باب میں اُن عدالتوں کی تصویریں پیش کی گئی ہیں جن میں بیک وقت انگریزی قانون، شرعی قانون اور فوجی قانون کے شکنجوں میں کمزور اور نادار شہریوں کو پھنسا کر لمبے عرصے کے لیے ان کی زندگی اجیرن کر دی جاتی تھی، کیونکہ وہ سیاسی ومعاشی طور پر بے بس و بے کس تھے۔ شاعرہ کہتی ہے:

ان کے لیے قانون کا ایک ہی دائرہ سچ مچ کافی نہ تھا
کہ ملک کا پرانا قانون
انہیں دیکھ کر چکرا جاتا ہے
تو پھر شریعت کا قانون لایا گیا ہے
لیکن اگر شریعت انہیں دیکھ کر رو پڑے
اور گلے لگا لے ان کو
ان کے خاک میں لتھڑے چہرے
چومنے لگے دیوانہ وار
تو پھر سمری ملٹری کورٹ کیونکر نہ ہوتا

(کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے: میں مٹی کی مورت ہوں، لاہور، ص 336)

اسی طویل نظم میں فہمیدہ ریاض کہتی ہیں کہ بے روزگاری اور جاگیردارانہ جبر سے پریشان ہو کر ملک کے نوجوان عرب ممالک کی طرف ہجرت کر رہے تھے، فوجی حکومت کے ناجائز قوانین اور دسمبر 1985 کے جعلی ریفرنڈم کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا، یہاں تک کہ عورتوں کو بھی کوڑے مارے جا رہے تھے۔ چوراہوں پر ٹینک اور مورچے لگائے گئے تھے اور شہریوں کی بنیادی آزادیاں سلب کر لی گئی تھی، کیونکہ تبدیلی کا نام لینا بھی جرم قرار پایا تھا:

سب کچھ جوں کا توں رکھنے کے لیے
تم نے ٹینک گھما دیے میری سڑکوں پر
سب کچھ جوں کا توں رکھنے کے لیے
تم نے بندوق تان لی میرے سینے پر
میرا سینہ
جو گہوارہ ہے اُن حسین گلابوں کا
جو کل تمہارے بچوں کے سینوں میں خیال بن کر کھلنے والے تھے
تم نے اُلٹا لٹکا دیا زمانوں کے علوم کو
تم نے انسانیت کو برہنہ کر کے کوڑے مارے
اور دردمند دلوں سے اٹھتی دعاؤں کے ہاتھ کاٹ دیئے

(کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے: مشمولہ، میں مٹی کی مورت ہوں، لاہور، ص 361)

اس مجموعے کا اختتام ایک رجائی نظم پر ہوتا ہے جہاں شاعرہ اپنی دھرتی کے عوام اور نادار لوگوں کو سنہرے مستقبل کی بشارت دیتی ہے اور کہتی ہے:

ممکن تو یہی ہے اے باغباں
ہزار گلابوں کا چمن کھلے

بارش کی بوچھار میں
اور ایک شاخچہ بھی تشنہ نہ رہے
میں اسی دن کے لیے گاتی ہوں
گاتی رہوں گی

(آخری گیت: مشمولہ 'میں مٹی کی مورت ہوں'، لاہور، 2013، ص 400)

فہمیدہ ریاض کا پانچواں مجموعہ 'ہم رکاب' ہندوستان میں جلاوطنی کے زمانے کی کہی گئی صرف تیرہ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کی آخری نظم رتھ یاترا کے دوران مشرقی یوپی میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کے تناظر میں کہی گئی تھی:

جہاں ہوں نفرت کے گھمسان
نہیں رہتے اُس جا بھگوان
نہیں کرتا ہے نظر رحیم
نہیں کرتے ہیں پھیرا رام
تمہاری منت کرتا ہے
خاک پر شیش جھکاتا ہے
کبیرا کچھ سمجھاتا ہے
اس سرجُو ندیا کے پار
کمل کنجوں پر جہاں بہار
کھڑے ہیں ہرے بانس کے جھنڈ
گڑا ہے گوتم کا سندیش

(پوروانچل، مشرقی یوپی کے کرفیو میں میں مٹی کی مورت ہوں، ص 431)

اس نظم میں وہ آپسی بھائی چارے اور مذہبی یگانگت کا پیغام دیتی ہیں۔ کچھ اسی نوعیت کا پیغام فہمیدہ ریاض نے اپنی نظم 'نیا بھارت' میں دیا تھا جو انہوں نے اپریل 2004 میں دہلی کے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی اور جس کے خلاف فرقہ پرستوں نے فساد برپا کیا تھا:

تم بالکل ہم جیسے نکلے
ہم دو قوم نہیں تھے بھائی
بھاڑ میں جائے شکشا و کشا
اب جاہل پن کے گن گانا
آگے گڑھا ہے یہ مت دیکھو
واپس لاؤ نیاز مانہ
کشٹ کرو تم آجائے گا
الٹے پاؤں چلتے جانا

پانچ مجموعوں پر مبنی کلیات 'میں مٹی کی مورت ہوں' (1988) کے بعد فہمیدہ ریاض کے دو شعری مجموعے: 'اپنا جرم ثابت ہے' اور 'آدمی کی زندگی' بھی شائع ہوئے تھے۔ ایک ناولٹ 'گودا وری' ایک رپورتاژ 'زندہ بہار' اور ایک افسانوی مجموعہ 'خطِ مرموز' بھی۔ اس دوران پاکستانی سیاست نے کافی مدوجزر دیکھے۔ اگست 1988 میں جنرل ضیاء الحق اپنے طیارے میں بم پھٹنے سے ہلاک ہوئے تو ملک میں جمہوریت بحال ہوئی۔ فہمیدہ ریاض کی ذات پر سے سیاسی دباؤ ختم ہوا اور ان کی بازآبادکاری ہوئی، جلاوطنی کا عذاب ختم ہوا۔

انہوں نے پسماندہ خواتین کی فلاح کے لئے 1997 میں ایک ادارہ 'Women & Development Association' بھی قائم کیا جلاوطنی ہی کے دور میں فہمیدہ ریاض نے ریڈیکل سندھی شاعر شیخ ایاز کے کلام کا اور ایرانی شاعرہ فروغ فرخ زاد کی نظموں کا اردو ترجمہ 'کھلے دریچے سے' کے عنوان سے کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ فروغ فرخ زاد کی نظموں کو پڑھتے ہوئے اکثر ان کو محسوس ہوا تھا کہ جیسے وہ اپنی ہی نظموں کا مطالعہ کر رہی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی دوسری کلیات 'سب لعل و گہر' (لاہور، 2011) شائع ہوئی، حالانکہ اب ملک میں جمہوریت بحال ہو چکی تھی، لیکن ضیاء الحق نے پاکستان کو مذہبی انتہا پسندی اور گروہی خون خرابے کی جس دلدل میں پھنسا دیا تھا، وہی صورت حال ان کے انتقال کے بعد بھی قائم رہی۔ اپنی ایک نظم 'خاکم بدہن' میں فرقہ جاتی تشدد و نفرت کی تبلیغ کا ایک منظر کھینچتے ہوئے فہمیدہ ریاض کہتی ہیں:

اک کوچہء پرشور میں اصحابِ طریقت
تھے دست و گریباں
خاکم بدہن پیچ عماموں کے کھلے تھے
فتوؤں کی وہ بوچھار کہ طبقات تھے لرزاں
دستانِ مبارک میں تھیں ریشانِ مبارک
موہائے مبارک تھے فضاؤں میں پریشاں
کہتے تھے وہ باہم کہ حریفانِ سیہ رو
کفار ہیں بدخو
زندیق ہیں ملعون ہیں سنتے ہیں مسلماں
ہاتف نے کہا اے ربِ سماوات
لاریب سراسر ہے بجا دونوں کے فتوات

(بحوالہ مرتضیٰ علی اطہر: فہمیدہ ریاض کی شاعری میں جدید عورت 'دہلی' 2009، ص 100)

حالانکہ پاکستان میں 1988 میں ضیاء الحق کے اقتدار کے خاتمے کے بعد آمریت اور ریاستی تشدد کا بدترین دور ختم ہوا۔ لیکن سماجی سطح پر موجود ہم مسائل، جاگیرداری، عورتوں کی آنر کلنگ، مذہبی اداروں اور فرقوں کے آپسی ٹکراؤ اور ترقی پسند قوتوں کے خلاف عام محاذ بندی کے سوالات آج تک برقرار ہیں اور فہمیدہ ریاض اپنے بعد کے شعری مجموعوں: 'آدمی کی زندگی' اور 'اپنا جرم ثابت ہے' میں ان سوالات کو موضوع بناتی ہیں۔ کیونکہ ان کا فن تاریخ کی سیاہ قوتوں سے ایک مسلسل مجادلے کے لئے وقف ہو چکا ہے۔

☆☆☆

ضروری اطلاع

اب اعزازیہ کی رقم ای سی ایس (ECS) کے ذریعے بینک کھاتے میں بھیجی جاتی ہے چیک سسٹم ختم ہو چکا ہے۔ آپ کی تخلیق 'آجکل' کے جس شمارہ میں شامل ہوئی ہے وہ شمارہ ملتے ہی ہمیں اپنی بینک کھاتے کی ڈیٹیل یعنی پاس بک کی فوٹو کاپی، چیک کی کاپی اور پین کارڈ کی کاپی فوری طور پر ای میل کریں یا ڈاک سے بھیجیں۔ مطلوبہ چیزیں دس پندرہ دنوں کے اندر اندر ہمیں موصول ہو جانی چاہئیں۔ بروقت موصول نہ ہونے کی صورت میں اعزازیہ کی رقم آپ کے کھاتے میں نہیں پہنچ پائے گی۔ (ادارہ)

معصوم مرادآبادی

پس مرگ نہ مجھ پہ ستم کرنا

فہمیدہ ریاض

یہ 1980 کی دہائی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ہم نے میدان کارزار میں قدم رکھا ہی تھا کہ شعروشاعری کا ذوق آن لیا۔اس زمانے میں معیاری مشاعرے اپنے عروج پر تھے۔ دہلی میں جن مشاعروں کو بڑی اہمیت حاصل تھی، ان میں پہلا نمبر دہلی کلاتھ ملز (ڈی سی ایم) کے مشاعرے کا تھا اور دوسرا لال قلعہ کے جشن جمہوریت کے مشاعرے کا۔ان دونوں مشاعروں میں چوٹی کے شعراء شرکت کرتے تھے۔ایک طرف جہاں لال قلعہ کے مشاعرے کے دعوت نامے آسانی سے دستیاب ہوجاتے تھے تو وہیں ڈی سی ایم کے مشاعرے کا دعوت نامہ حاصل کرنے کے لئے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ایک روز بڑی مشکل سے ہم کسی طرح ڈی سی ایم کے مشاعرے کا دعوت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور شام کو ماڈرن اسکول جا پہنچے۔ڈی سی ایم کے مشاعرے کی سب سے بڑی کشش مشہور ہندوستانی شعراء کے ساتھ ساتھ ممتاز پاکستانی شعراء کی شرکت ہوا کرتی تھی۔ فہمیدہ ریاض کو پہلی بار اسی مشاعرے میں دیکھا اور سنا۔وہ پاکستان سے جلاوطن ہوکر نئی نئی آئی تھیں اور یہاں کی ادبی محفلوں میں سب کی توجہ کا مرکز تھیں۔اسی دور میں انہوں نے اپنی مشہور نظم 'تم بالکل ہم جیسے نکلے' کہی تھی۔ جوان سے ہر مشاعرے اور نشست میں بہ اصرار سنی جاتی تھی۔ڈی سی ایم کے اس مشاعرے میں فہمیدہ ریاض نے یہ نظم ممتاز صحافی کلدیپ نیر کے اصرار پر دومرتبہ سنائی اور سامعین کا دل جیت لیا۔خوبصورت آنکھوں، چوڑی پیشانی اور لمبی ناک والی فہمیدہ ریاض کی آواز میں خاص سوز وگداز تھا۔وہ اپنی بیاض ساتھ رکھتی تھیں اور اسی میں دیکھ کر نظمیں سناتی تھیں۔تاہم ان کی ایک ادا ہمیں کچھ اٹ پٹی سی لگی اور وہ تھی ان کی نرم وگداز انگلیوں میں سگریٹ۔فہمیدہ ریاض ترقی پسند تحریک کی پیداوار تھیں اور اپنے خیالات کے اعتبار سے خاصی لبرل بھی واقع ہوئی تھیں۔ ہندوستان میں ان کی مقبولیت کی بڑی وجہ ان کی زبان تھی جو ہندوستان کی مٹی میں رچی بسی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زہرہ نگاہ، پروین شاکر اور کشور ناہید جیسی پاکستانی شاعرات برصغیر ہندوپاک میں خاصی مقبول تھیں۔ان شاعرات کی زبان پر فارسی اور عربی کے اثرات تھے جبکہ فہمیدہ ریاض عام فہم زبان میں شاعری کرتی تھیں۔اپنی مقبول نظم 'تم بالکل ہم جیسے نکلے' میں انہوں نے ہندی کے الفاظ بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں۔اس نظم میں انہوں نے ہندوستان میں پرورش پارہی عصبیت اور فرقہ واریت کا موازنہ پاکستانی معاشرے کی شدت پسندی سے کیا ہے اور دونوں ملکوں کے انتہا پسندوں کو ایک ساتھ دوزخ میں رہنے کی نوید سنائی ہے۔

پاکستانی معاشرے کی جس گھٹن سے نکل کر وہ ہندوستان آئی تھیں، یہاں کے ایک طبقے میں اسے پروان چڑھتا دیکھ کر وہ پریشان ہواٹھیں۔فہمیدہ ریاض نے اپنی زندگی کے کوئی سات برس دہلی میں گزارے اور اس دوران وہ جامعہ ملیہ سے بھی وابستہ رہیں۔ فہمیدہ ریاض ایک انقلابی شاعرہ کے علاوہ ایک منفرد ادیب اور انسانی حقوق کی کارکن بھی تھیں۔جدید عہد کی ایک نمائندہ شاعرہ کے طور پر انہوں نے ادب کی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔فہمیدہ ریاض برصغیر ہندوپاک کی ممتاز شاعرہ، دانشور اور مترجم ہونے کے ساتھ نسائی ادب اور روایات شکنی کا معتبر حوالہ تھیں۔انہوں نے تمام عمر جمہوریت اور حقوق نسواں کے تحفظ کے لئے جنگ کی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ایک سیاسی کارکن کے طور پر سرگرم رہیں۔وہ پاکستان میں عورتوں کی آزادی کی سب سے بڑی علمبردار تھیں۔انہوں نے گزشتہ 22 نومبر کو جب 73 برس کی عمر میں مہینوں کی علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا تو لوگوں کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔فہمیدہ ریاض اپنی اذیت ناک زندگی کے جتنے دن بھی زندہ رہیں وہ حالات سے جنگ کرتی رہیں۔زمانے نے انہیں جو دکھ دیئے تھے وہ انہیں وقت سے پہلے ہی مار دینے کے لئے کافی تھے لیکن انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا اور اپنی زندگی کے دن پورے کئے۔یہ کیا کم تھا کہ ان کا جواں سال خوبصورت بیٹا کبیر 26 برس کی عمر میں امریکہ کی ایک نہر میں ڈوب کر فوت ہوگیا۔اس ذاتی غم کو سنبھالنے کی انہیں مہلت ہی کہاں ملی کہ جلاوطنی کا کرب جھیلنا پڑا۔انہوں نے 1979 اپنے رسالے 'آواز' میں بھٹو کی پھانسی پر لکھا کہ ''آج بھٹو کو نہیں جمہوریت کو پھانسی دی گئی ہے۔'' یہ جملہ ان پر اتنا بھاری پڑا کہ جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے کارندے ان پر ٹوٹ پڑے۔انہوں نے ارباب اقتدار کے اتنے ظلم سہے تھے کہ انہیں مرنے کے بعد بھی اس سلسلے کے ختم ہونے کا یقین نہیں تھا۔بقول خود

یارو بس اتنا کرم کرنا
پسِ مرگ نہ مجھ پہ ستم کرنا
مجھے کوئی سند نہ عطا کرنا دینداری کی
مت کہنا جوشِ خطابت میں
دراصل یہ عورت مومن تھی

Z-103، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی۔110031
فون: 9810780563 masoom.moradabadi@gmail.com

مت اٹھنا ثابت کرنے کو ملک وملت سے وفاداری
مت کوشش کرنا اپنا لیں حکام کم از کم لاش ہی۔

فہمیدہ ریاض آزادی سے قبل 28 جولائی 1945 کو مغربی یوپی کے شہر میرٹھ کے ایک علمی اور ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ریاض احمد خاں سرکاری ملازم تھے اور ان کے ٹرانسفر کی وجہ سے ان کا خاندان حیدرآباد سندھ منتقل ہوگیا۔ ابھی وہ چار سال کی ہی تھیں کہ اپنے والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئیں۔ ان کی پرورش و پرداخت والدہ نے کی۔ انہوں نے بچپن میں ہی سندھی زبان سیکھی اور سندھی ادب کا مطالعہ کیا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی طلباء کی سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں۔ ایوب خاں کے زمانے میں انہوں نے طلباء یونین پر پابندی کے خلاف قلم اٹھایا۔ انہوں نے اوائل عمری میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ زور بیان کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ محض 15 برس کی عمر میں ان کی نظم احمد ندیم قاسمی کے رسالے 'فنون' میں شائع ہوئی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'پتھر کی زبان' 1967 میں اس وقت منظر عام پر آیا جب وہ 22 برس کی تھیں۔ اسی زمانے میں ان کی شادی ہوئی اور وہ لندن چلی گئیں جہاں بی بی سی کی اردو سروس سے بطور براڈ کاسٹر وابستہ رہیں۔ پاکستان واپسی کے بعد انہوں نے ایک اشاعتی ادارے کی بنیاد ڈالی اور اپنا جریدہ 'آواز' جاری کیا۔ اپنے انقلابی نظریات اور حکومت پر تنقید کے سبب 'آواز' کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی اور انہیں جلاوطنی پر مجبور ہونا پڑا۔ فہمیدہ ریاض اور ان کے شوہر نے ایک درجن سے زائد مقدمات کا سامنا کیا جن میں بغاوت کا مقدمہ بھی شامل تھا۔ وہ نیشنل بک فاؤنڈیشن اور اردو ڈکشنری بورڈ کی سربراہ بھی رہیں۔ شعری مجموعوں کے علاوہ 'گودا وری' کے عنوان سے ان کا ایک ناول بھی شائع ہوا جس کا انگریزی ترجمہ ہو چکا ہے۔ 'خط مرموز' اور 'کراچی' کے عنوان سے بھی ان کے ناول شائع ہوئے۔ 2011 میں ان کی کلیات 'سب لعل وگوہر' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ آصف فرخی نے ان کی نظموں کا ایک انتخاب آکسفورڈ سے شائع کرایا۔ 'بدن دریدہ' (1978) آدمی کی زندگی (1999) ان کی نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ 'پتھر کی زبان' جو 1967 میں پاکستان سے شائع ہوا تھا، اس کا ہندوستانی ایڈیشن 1982 میں ان کے دہلی کے قیام کے دوران مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا۔ اسی طرح 1978 میں پاکستان سے شائع ہونے والے مجموعے 'بدن دریدہ' کو 1987 میں والی آسی نے لکھنؤ سے شائع کیا۔ انہوں نے سندھی شاعر شیخ ایاز کے کلام کا اردو ترجمہ کرنے کے علاوہ مثنوی مولانا روم کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا۔ ان کی دیگر اہم تصنیفات میں 'کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'، 'گلابی کبوتر'، 'آدمی کی زندگی'، 'دھوپ'، 'کھلے دریچے سے'، 'حلقہ میری زنجیر کا'، 'قافلے پرندوں کے' قابل ذکر ہیں۔ ان کی کتابوں کی مجموعی تعداد 15 ہے۔

انہیں اوائل عمری میں ہی شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور اس کا آغاز انہوں نے عشقیہ شاعری سے کیا لیکن وہ جلد ہی انسانی حقوق کی علمبردار بن گئیں۔ انہوں نے غزل کی بجائے نظم میں طبع آزمائی شروع کی۔ غزل کی بجائے نظم کا میدان منتخب کرنے کی وجہ انہوں نے خود یہ بتائی کہ وہ قافیہ اور ردیف کے لئے شاعری نہیں کرنا چاہتیں لیکن شاید اس کی ایک وجہ غزل کی روایت اور اس کے موضوعات بھی تھے کہ وہ 'عورتوں سے باتیں کرنے' کی نہیں بلکہ 'عورتوں کی بات' کرنے کے لئے شاعری کر رہی تھیں۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری میں عورت کے اپنے وجود کا بھرپور احساس نمایاں ہے۔ فہمیدہ کی عورت دوسروں کے وجود کا سایہ نہیں بلکہ ایک مکمل شخصیت ہے۔ 1973 میں دوسرے شعری مجموعے 'بدن دریدہ' کی اشاعت کے بعد ان پر فحاشی کے الزامات عائد کئے گئے۔ 'مقابلہ حسن' کے عنوان سے ان کی ایک مختصر نظم ملاحظہ ہو ؎

کولہوں میں بھنور جو، ہیں تو کیا ہے
سر میں بھی ہے جستجو کا جوہر
تھا پارہ دل بھی زیر پستاں
لیکن میرا مول ہے جو ان پر
گھبرا کے نہ یوں گریز پا ہو
پیمائش میری ختم ہو جب
اپنا بھی کوئی عضو ناپو!

فہمیدہ ریاض کی شاعری کو غیر شائستہ قرار دیا جاتا رہا کیونکہ انہوں نے جنس، تخلیق اور بہت سے منفرد موضوعات پر قلم اٹھایا۔ فہمیدہ کی شاعری میں مشرقی عورت کی مجبوریاں بھی نظر آتی ہیں اور بیسویں صدی کی عورت کی روایات سے آزاد اور خود مختار ہونے کی خواہش بھی۔ ان کا خواب ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں عورت اور مرد کو برابری مل سکے۔ جہاں عورت دوسرے درجے کی مخلوق نہ ہوں۔ آمنہ مفتی نے بی بی سی اردو سروس کے لئے ان کے انتقال پر اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فہمیدہ کو لکھنا تھا، وہ سب جو وہ محسوس کرتی تھی۔ وہ مناظر جو عام نظر سے پوشیدہ تھے مگر اس کی سیاہ آنکھ کی پتلی انہیں پردوں میں بھی بھانپ لیا کرتی تھی۔ وہ انسانوں کے باطن سے اٹھتی سڑاند کو سونگھ لیا کرتی تھی جسے چھپانے کو سرزمین حجاز کی تمام خوشبوئیں بھی ناکافی تھیں۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی بصارت خون کے ان دھبوں کو بھانپ لیا کرتی تھی جو آستینوں پہ سوکھ کے کتھے کے سے بھورے داغ بن جاتے ہیں۔ ان صلاحیتوں کا فرد منافقوں کے معاشرے میں کب قبول کیا جاتا ہے۔ اس کے لفظوں کی طاقت، اس کے لفظوں کا آہنگ، اس کے لہجے کی تپک سہی نہیں گئی۔''

فہمیدہ ریاض نے جب اپنے جریدے 'آواز' کی اشاعت شروع کی تو اس کے سیاسی مواد نے جنرل ضیاء الحق کی آمرانہ حکومت کو لرزہ براندام کر دیا۔ انہیں اپنی بے باکی اور سیاسی نظریے کی قیمت چکانی پڑی۔ 1980 کے ابتدائی زمانے میں ہی فہمیدہ ریاض اور ان کے شوہر ظفر کو مختلف مقدمات میں ماخوذ کر لیا گیا اور 'آواز' کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پرآشوب دور میں فہمیدہ ریاض نے اپنے ترقی پسند نظریات اور سیاسی اپروچ کے سبب بے شمار چیلنجوں کا مقابلہ کیا۔ ضیاء الحق کے دور آمریت میں ان پر کم وبیش 10 مقدمات چلائے گئے۔ یہاں تک کہ انہیں پاکستانی پینل کوڈ کی دفعہ 124A کے تحت بغاوت کا ملزم بھی گردانا گیا۔ فہمیدہ اور ان کے شوہر کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن فہمیدہ کے چاہنے والے کسی طرح انہیں رہا کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ حالات کا جبر اتنا سخت تھا کہ فہمیدہ ریاض نے جلاوطنی کو فوقیت دی اور وہ اپنے دو چھوٹے بچوں اور ایک بہن کے ساتھ ہندوستان آگئیں۔ اس دوران ہندوستان میں ان کی دوست اور معروف ہندی شاعرہ امریتا پریتم نے ان کی مدد کی اور اس وقت کی وزیراعظم

اندرا گاندھی سے بات کر کے انہیں دہلی میں سیاسی پناہ دلا دی۔ ان کے دونوں بچوں نے بھی دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ وہ کوئی سات سال تک دہلی میں رہیں اور ان کا بیشتر وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں گزرا۔ جیل سے رہائی کے بعد ان کے شوہر بھی دہلی آ گئے تھے۔ ضیاء الحق کی حادثاتی موت کے بعد فہمیدہ ریاض جونیجو کے دور میں وطن واپس ہوئیں۔ لیکن وطن واپسی کے بعد بھی ان کی مصیبتوں کا دور ختم نہیں ہوا۔ لوگ ان سے دامن بچاتے رہے۔ ان کیفیات کو بیان کرتے ہوئے مشہور افسانہ نگار زاہدہ حنا نے لکھا ہے:

''اپنے وطن واپس آنے کے بعد بھی زمانہ ان پر کچھ خاص مہربان نہیں رہا۔ زندگی کے آخری برسوں میں وہ شدید بیماریاں جھیلتی رہیں۔ سب سے بڑا غم ان کی زندگی کا ان کے جوان بیٹے کبیر کی ہمیشہ کی جدائی کا تھا۔ کبیر کے لئے یہ مصرعہ صحیح بیٹھتا ہے:

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

تکلیف کے ان دنوں میں بھی قلم ہاتھ سے دور نہیں کیا۔ وہ شعر کہتی رہیں۔ ترجمے کرتی رہیں۔ باغی انہیں لبھاتے رہے۔'' (دینک بھاسکر 2 دسمبر 2018)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مارشل لاء کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں انتہائی اذیت والی زندگی گزارنے والی فہمیدہ ریاض کو صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی، ستارہ امتیاز اور بے شمار اعزازات سے بھی نوازا گیا اور ان کی پذیرائی بھی ہوئی لیکن وہ تمام عمر ایک کرب اور بے چینی کا شکار رہیں۔ ایسا ہی کرب جو اپنی ہی طرح زندگی گزارنے والوں اور ایک عقیدے اور نظریے پر قائم رہنے والوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ فہمیدہ ریاض دراصل ایک بے چین روح کا نام تھا وہ ہمیشہ جمہوری قدروں اور نسائی حقوق کے لئے جدوجہد کرتی رہیں اور انہوں نے کبھی اسٹیبلشمنٹ سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ان کی جگہ نرم و نازک خدوخال والی کوئی دوسری خاتون ہوتی تو نہ جانے کب کا حالات سے سمجھوتہ کر لیتی لیکن فہمیدہ ریاض کی سرشت میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف لڑنا لکھا ہوا تھا۔ سماج کی روایتی قباحتوں سے بغاوت اور ظلم و ناانصافی کے خلاف مزاحمت ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ 1973 میں اپنے دوسرے مجموعے 'بدن دریدہ' کے دیباچے میں فہمیدہ ریاض نے زندگی کی کش مکش اور تمام عمر حالت جنگ میں رہنے کی کیفیت اور اپنے ناقدوں کی بے باکی اور بلند آہنگی پر اعتراضات کا بھرپور جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

''کارگاہ ہستی میں کسی حساس ذی روح پر وہ مقام نہیں آیا ہوگا جب اس نے خود کو مقتل کے دروازے پر نہ پایا ہو، جب اسے اپنے وجود کی قیمت نقد جاں سے نہ چکانی پڑی ہو۔ لیکن جب جاں سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جھکا کر کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنا دیں۔ آخری سانس تک جنگ کریں، سو میں نے بھی اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں پائی۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں، ایک رجز ہیں، جسے بلند آواز سے پڑھتی ہوئی میں اپنے مقتل سے گزری، اس لحاظ سے 'بدن دریدہ' ایک رزمیہ ہے اسے پڑھ کر لوگ چونکے تو کیا برا ہوا۔

(پیش لفظ 'بدن دریدہ' اشاعت لکھنؤ 1987 صفحہ 13)

فہمیدہ ریاض کی شاعری پر اعتراض کرنے والوں نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو عصمت چغتائی کے فکشن کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن فہمیدہ ریاض کسی کے اعتراض یا چڑھی ہوئی بھنوؤں کی پرواہ کب کرتی تھیں۔ وہ نظمیں لکھتی رہیں اور لفظوں کا جادو جگاتی رہیں۔ انہوں نے صرف اپنی جدوجہد کو قلم تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میدان کارزار میں بھی اسی زور و شور کے ساتھ اتریں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اپنی جرأت اور بے باکی کی بھاری قیمت چکانی پڑی لیکن انہوں نے لڑتے ہوئے جان ہاری۔ بقول خود

رن بھومی میں لڑتے لڑتے میں نے کتنے سال
ایک دن جل میں چھایا دیکھی چٹے ہوگئے بال
پاپڑ جیسی ہوئی ہڈیاں جلنے لگے ہیں دانت
جگہ جگہ جھریوں سے بھر گئی سارے تن کی کھال

فہمیدہ ریاض اردو کی ان ممتاز شاعرات میں سے ایک تھیں جن کا اپنا ایک لہجہ اور انداز تھا۔ انہوں نے عورت کے تقدس اور احترام کے لئے آواز اٹھائی اور اپنی شاعری کو نیا رنگ عطا کیا۔ آمنہ مفتی کے یہ الفاظ جو انہوں نے فہمیدہ ریاض کو خراج عقیدت کے طور پر لکھے ہیں ملاحظہ ہوں:

''جانے ان قدموں کے نشانوں پر کون چلے گا۔ ان کے جانے کے بعد سوچتی ہوں کہ دنیا ان سے خواہ مخواہ ڈرتی رہیں۔ وہ تو صرف ایک ننھی سی قینچی لئے حد سے بڑھے ہوئے معاشرتی رویوں کی کاٹ چھانٹ کرتی پھرتی تھیں۔ جانے لوگ ان سے کیوں ڈرتے تھے؟ نہ فہمیدہ رہیں، نہ ان سے ڈرنے والے رہے مگر کہانی اب بھی وہی ہے۔ فہمیدہ جیسے لوگ مرتے نہیں اور ان سے خائف سوچ بھی۔ دیوار پر بیل ایک بار پھر حد سے بڑھ گئی ہے۔ سوچتی ہوں اب کی بار فہمیدہ کس شکل میں جنم لے گی اور اس کے ہاتھ میں اب کی بار کیا ہوگا؟ تلوار، قینچی، درانتی یا فقط خون دن میں ڈبوئی انگلیاں؟''

فہمیدہ ریاض کی سب سے قریبی دوست کشور ناہید نے ان کی دربدری اور مصائب و آلام کی دردناک منظر کشی کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ چادر، چار دیواری اور کوتوال بیٹھا ہے جیسی نظمیں ہی نئی نسل پڑھے گی تو سوچے گی کہ فہمیدہ نے کیسے ظالموں کے دور میں زندگی کی۔ روزنامہ 'جنگ' مؤرخہ یکم دسمبر 2018 میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض پر اپنے کالم کا اختتام ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

''وہ خوبصورت آنکھوں والی فہمیدہ کہ جب وہ لندن سے لوٹی تھی تو اخبار والے اسکی تصویر ہاتھ میں سگریٹ لئے، اپنے ٹائٹل پیج پر شائع کرتے تھے کہ جس کے شعروں کو سننے کے لئے، افسران شام میں برپا کرتے تھے۔ وہ فہمیدہ فروغ فرخ زاد، روحی کی فارسی شاعری کو اردو کا پیرہن پہناتی رہی، بیماری کی حالت میں بھی دوستوں کے ناول کا تجزیہ کرتی رہی۔ اوہان پامک کے ناولوں کے ترجمے کرتی رہی اور سب سے بڑھ کر عمر کے اس آخری حصے میں فیس بک پر، ادبی اور سیاسی موضوعات پر چومکھی لڑائی لڑتی رہی۔ وہ ابھی 20 برس کی ہوئی تھی کہ اس کی کتاب پتھر کی زبان نے بڑے دھانسو نقادوں کی زبان بند کر دی تھی۔ ''ہزار اچھوتے، کنوار سینے/نظر میں اسکی چمک رہے تھے''۔ وہ اتنی حساس تھی کہ شیخ مجیب الرحمان کے قتل سے لیکر نذیر عباسی، ایازسموں اور سب سے بڑھ کر بی بی شہید، فیض صاحب اور فراق صاحب پہ بھی نظمیں لکھی تھیں۔ چادر، چار دیواری اور کوتوال بیٹھا ہے، جیسی نظمیں نئی نسل پڑھیگی تو سوچے گی کہ فہمیدہ نے کیسے ظالموں کے دور میں زندگی کی۔ شکر ہے قصیدہ لکھنے والوں کے شہر اسلام آباد میں نہیں اُس نے شاہ حسین کے شہر لاہور میں دفن ہونا پسند کیا۔''

☆☆☆

ڈاکٹر ریحان حسن

ملتے ہیں کہاں ساتھ کے کھیلے ہوئے بھائی

27 نومبر کی صبح گیارہ بجے یہ اطلاع ہمارے اوپر پہاڑ بن کر گری جب ممبئی سے میرے چھوٹے بھائی زبیر حسن کا فون آیا کہ بھائی، بھائی جان کی خیریت معلوم نہیں مل رہی ہے۔ آپ کسی کو ایرا میڈیکل کالج بھیجیں کہ صحیح حالات کا اندازہ ہو سکے۔ میں نے فوراً میثم زیدی صاحب کو فون کیا کہ آپ ایرا میڈیکل کالج جا کر صحیح صورت حال سے آگاہ کریں۔ انہوں نے کہا کہ میری والدہ کی تعزیت کے لیے ممبئی سے دانشور حضرات تشریف لائے ہوئے ہیں لیکن آپ کا کام ہمارے لیے اولیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے مہمانوں کو بہ عجلت رخصت کر کے میڈیکل کالج کے آئی سی یو میں پہنچے لیکن وہاں بھائی جان کی اطلاع نہ مل سکی۔ میں نے کہا کہ آپ سے میڈیکل کالج کا سارا اسٹاف واقف ہے۔ دوسرے ذرائع بروئے کار لا کر حالات بتائیں۔ تھوڑی دیر بعد جو خبر ملی اس کی سماعت کے لیے میرے کان تیار نہ تھے۔ انہوں نے بے ساختہ کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نہیں نہیں یہ سچ نہیں ہو سکتا۔ میثم بھائی کی آواز آ رہی تھی ریحان بھائی آپ اپنے کو سنبھالئے آپ کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ میں حسن مثنیٰ بھائی کے بچوں اور بیوی کو اپنے گھر لے جا رہا ہوں جب تک میت گوپالپور کے لیے روانہ نہیں ہو جاتی میں یہیں رہوں گا۔ اتفاق سے محمد حسن گوپالپور میں ہی موجود تھا۔ خبر کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ وہاں کے انتظامات کو دیکھئے اس کی آواز اور کرب کے احساس سے میرے صبر کا بندھ ٹوٹ گیا۔ آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ پروفیسر عزیز عباس اور ڈپارٹمنٹ کے کلرک پرم جیت سنگھ فلائٹ دیکھنے لگے۔ مجھے اپنا ہوش نہ تھا بالآخر پروفیسر عزیز عباس نے فیصلہ کیا کہ میں پہلے کسی طرح دہلی پہنچ جاؤں۔ دہلی پہنچنے کے وقت پٹنہ کے لیے صبح کی فلائٹ تھی بالآخر تقی اصغر پرنس نے فیصلہ کیا کہ بائی روڈ ہم لوگ دہلی سے روانہ ہو جائیں تا کہ وقت پر پہنچ سکیں۔

پروفیسر عزیز عباس اور پروفیسر عراق رضا نے ہمیشہ کی طرح اس کٹھن وقت میں مجھے پھر سہارا دیا۔ پروفیسر شارب ردولوی کو گورونانک یونیورسٹی سے نکلتے ہوئے بھائی جان کے انتقال کی اطلاع دی وہ آناً فاناً وقار رضوی کو لے کر ایرا میڈیکل کالج پہنچ گئے وہاں سے انہوں نے مجھے فون کیا کہ میں یہاں آ گیا ہوں۔ گفتگو سے انہوں نے میری کیفیت کا اندازہ کیا اور کہا کہ ریحان جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اب اپنے آپ کو سنبھالو۔ یہ میرا ذاتی نقصان بھی تھا اور قومی و ادبی نقصان بھی، بھائی جان کے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کام میں تمام بھائیوں اور بہن کا سرگرم تعاون رہتا تھا۔ ہم لوگوں کا مطمح نظر یہ تھا کہ بھائی جان کسی منزل تک پہنچ جائیں گے تو ہم لوگوں کو بھی منزل مل جائے گی۔ گوپالپور سے رکسول، ڈالٹن گنج گا رو بلاک، پٹنہ، لکھنؤ اور جے این یو (جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی) کی وہ تمام یادیں امنڈ امنڈ کر نظروں کے سامنے آنے لگیں جنہیں یاد کر کے دل بیٹھا جا رہا تھا اور یہ احساس بڑا جانکاہ تھا کہ اب بھائی جان نے تو اپنا دائمی بسیرہ وہاں بنا لیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ گیارہ محرم الحرام کو جب میں ایرا میڈیکل کالج دیکھنے گیا تھا تو بھائی جان نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور صرف ایک جملہ کہا کہ ہم بچیں گے نہیں بھائی جان کا یہ جملہ نا قابل برداشت تھا۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر مجھے رونا آ گیا اور روتے ہوئے ہی میں اپنے بھائی سے کس کیفیت میں رخصت ہوا اس کے لیے الفاظ نہیں جو بیان کر سکیں۔ باتیں اور یادیں تو بہت ہیں جس کے لیے دفتر درکار ہے انشاء اللہ کسی اور موقع پر یادداشت تحریر کروں گا۔ ابھی اس حالت میں نہیں ہوں کہ تفصیلی روشنی ڈال سکوں۔ لیکن جب جب مدبر نعیم، کاوش کریم اور نوازش کبریا پر نظر پڑتی ہے تو دل تڑپ جاتا ہے۔ لب شکوہ سے قریب تر ہونے لگتے ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں دعا یہ ہے کہ انہیں خدا علم کی دولت سے مالا مال کرے اور وہ بھی ایسا ہی نام روشن کریں جیسا بھائی جان نے کیا۔ ماہنامہ آجکل کے مدیر حسن ضیاء صاحب کے حکم کی تعمیل میں یہ چند سطور رقم کر دیے ہیں تا کہ بھائی جان پر کام کرنے والوں کے لیے ابتدائی مواد فراہم ہو سکے۔

ادبی ذخیرہ میں ہم دونوں بھائیوں نے مل کر کئی کتابیں ترتیب دیں، متعدد سمینار کرائے، والد محترم سید محمد نعیم رضوی نے ہم بھائیوں کے لیے گوپالپور میں لائبریری بنائی جس کا نام میں نے ایلیا لائبریری تجویز کیا تا کہ وطن کے اہل علم لائبریری سے مستفیض ہو سکیں۔ ابھی کام بہت باقی تھا لیکن افسوس کہ موت کے بے رحم پنجے نے نہ جانے کتنے کام ادھورے کر دیے۔

ڈاکٹر حسن مثنیٰ کا اصل نام سید مثنیٰ حسن رضوی تھا۔ قلمی نام پروفیسر شارب ردولوی نے حسن مثنیٰ رکھا۔ ان کی پیدائش 14 اپریل 1972 کو پھولپور الہ آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گوپالپور مدرسہ ناصر الایمان میں ہوئی۔ اس کے بعد مہولی ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ 1986 میں ہزاری مل ہائی اسکول رکسول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے آنرس کیا اور اسی یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس سے ایم اے بھی کیا۔ اس کے علاوہ 1997 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے 1998 میں اردو دبستان میں ایم اے کیا۔ 2000 میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری پر مقالہ لکھ کر ایم فل اور 2005 میں ریڈیو نشریات آغاز وارتقا پر مقالہ لکھ

شعبۂ اردو، فارسی گرونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر، پنجاب
فون:08559020015 drraihanhasan@gmail.com

کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ایم فل کا مقالہ پروفیسر شارب ردولوی اور پی ایچ ڈی کا مقالہ پروفیسر شاہد حسین کے زیر نگرانی مکمل کیا۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے قیام کے دوران ہندوستان کے غیر ممالک کے نیوز چینل کی خبروں کی مانیٹنگ کے لیے بھی جاتے تھے جس کا نام سینٹرل مانیٹنگ سروس (CMS) ایجنسی تھا۔ فی الوقت اس ایجنسی کا نام این ٹی آر او ہوگیا ہے۔ آپ کا ہفتہ روزہ عالمی سہارا میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے تقرر بھی ہوا۔ اثنائے ملازمت کچھ باتیں ایسی ہوئیں کہ انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور زی نیوز میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بعد لکھنؤ میں واقع امریکن انسٹی ٹیوٹ میں 2007 میں امریکی بچوں کو پڑھایا۔ امریکہ انسٹی ٹیوٹ میں تدریس کے فرائض 15 جون سے 15 اگست تک انجام دیے۔ بالآخر 2008 میں جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن کے تحت اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تقرر ہوا جہاں وہ صدر شعبہ کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان میں جو خوب سے خوب تر کی تلاش کا جو ملکہ تھا وہ یہاں بھی بروئے کار رہا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں کے تعاون سے رانچی کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلایا۔

دراصل ڈاکٹر حسن مثنیٰ کا پہلا ادبی کام 2003 میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری نام سے ایلیا پبلی کیشنز سے شائع ہوا اور 2006 میں ریڈیونشریات آغاز وارتقا بھی اسی ادارہ سے طبع ہوا۔ دراصل ایلیا پبلی کیشنز کا ادارہ دونوں بھائیوں نے اپنی کتب کی اشاعت کے لیے قائم کیا تھا۔ 2006 میں ہی مجموعہ مضامین فکر فن فنکار بھی منصۂ شہود پر آیا۔

چودھری سبط محمد نقوی کے خدمات اور کارناموں پر مشتمل مضامین ''ادیب محقق صحافی چودھری سبط محمد نقوی'' کے نام سے توحید پرکاشن کینڈر لکھنؤ سے دونوں بھائیوں کے زیر ترتیب طبع ہوا۔ اس کے علاوہ چودھری سبط محمد نقوی کے مضامین کا مجموعہ 'تحقیق وتفہیم' کے نام سے 2007 میں ایلیا پبلی کیشنز سے بھائی جان اور میری سعی وکوشش سے شائع ہوا۔ دراصل چودھری سبط محمد نقوی سے میرے قریبی تعلقات وروابط تھے اس لیے ان کے فرزندان محمد عسکری اور مجلسی صاحبان وغیرہ نے چودھری صاحب سے متعلق سارے کام میرے سپرد کر دیے تھے۔ یہ کتابیں چودھری سبط محمد نقوی کی شخصیت اور علمی کارناموں سے بخوبی متعارف کراتی ہیں۔

ہندوستان کی آزادی کے جب ایک سو پچاس سال مکمل ہوئے تو ڈاکٹر حسن مثنیٰ نے ''1857: نکات اور جہات'' کے نام سے آزادی سے متعلق مضامین کو یکجا کیا اور 2007-08 میں کتابی دنیا ترکمان گیٹ دہلی سے شائع کرایا جسے ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کے حوالے سے دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ (این بی ٹی) نے بھگت سنگھ کے سیاسی دستاویز (ترجمہ) 2010 میں طبع کیا۔ دہلی یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر اساتذہ پر مونوگراف لکھوائے گئے۔ اس موقع پر حسن مثنیٰ نے 2010 میں پروفیسر شارب ردولوی کا مونوگراف تحریر کیا۔ 2010 میں ہی 'ذرہ بھر روشنی' (مجموعۂ مضامین) ادبستان پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوا۔ 2012 میں شارب ردولوی! ادبی سفر کے پچاس سال حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد سے طبع ہوا جسے شارب شناسی کے سلسلے میں ادبی دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ این بی ٹی نے نرنجن سنگھ تسنیم کی کتاب کا ترجمہ 2013 میں 'تلاش ناتمام' کے نام سے چھاپا۔ لکھنؤ میں میرے دوست دلشاد مہدی کے این جی او اور این سی پی یو ایل کے زیر اہتمام انیس اور انیس شناس کے حوالے سے سمینار منعقد کیا گیا۔ اس سمینار میں پڑھے ہوئے مقالوں کو 2013 میں انیس اور انیس شناسی کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ 2015 میں ایم آر پبلی کیشنز سے مضامین کا مجموعہ 'میڈیا قانون اور سماج' شائع ہوا۔ میر ببر علی انیس کے حوالے سے ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں جو مضامین شائع ہوئے تھے انہیں یکجا کر کے 2016 میں ''انیس کا شعور فن'' کے نام سے زیور اشاعت سے آراستہ کیا۔ این سی پی یو ایل نے 2017 میں یاس یگانہ چنگیزی پر مونوگراف لکھوادیا جو اس ادارہ سے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا۔ 2017 میں ہی دیویندر ستیارتھی (ترجمہ) بھی شائع ہوا۔ اس کے علاوہ مجموعۂ مضامین ''آئینہ ادراک'' انعم پبلی کیشنز رانچی سے حال ہی میں طبع ہوا ہے۔ 'خاک کے پردے سے' ایک کتاب زیر طبع تھی نیز کئی علمی اور ادبی کام اور تھے جو ہنوز باقی تھے کہ پیغام اجل آپہنچا اور دنیا ان کے مزید علمی وادبی کارناموں سے محروم ہوگئی۔

ڈاکٹر حسن مثنیٰ کو مختلف کتابوں پر انعامات واعزازات سے بھی نوازا گیا۔ بہار اردو اکادمی نے ریڈیو نشریات: آغاز وارتقا کے لیے انہیں 2011 میں انجم مانپوری ایوارڈ نیز بہار اردو اکادمی نے ہی 2013 میں بھگت سنگھ کے سیاسی دستاویز کے لیے حسن عسکری ایوارڈ اور ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی یوپی نے اردو ادب ایوارڈ عطا کیا۔ اس کے علاوہ یوپی اردو اکادمی نے بھی اعزاز سے نوازا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے مخلص اور محنتی ادیب بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہیں جو بھی اعزازات وانعامات ملے ان کی خدمات کو دیکھ کر بہت کم ہیں۔ ظاہر ہے کہ آج بھائی جان ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ زندہ رہیں گے اپنے علمی اور ادبی کارناموں کی بدولت۔ انہوں نے رانچی کالج (یونیورسٹی) میں درس وتدریس کے فرائض جس خوبی سے انجام دیے وہ شاگردان، ان کے علمی سفر کو آگے بڑھائیں گے خصوصاً ان کے پہلے پی ایچ ڈی کے اسکالر طلحہ ندوی ان کے ادبی سفر کو ضرور آگے لے جائیں گے لیکن ان کی ناوقت موت صرف میری ہی نہیں ادبی خانوادہ کا بھی خسارہ ہے۔

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

☆☆☆

دہلی میں ماہنامہ آجکل کے فروخت مراکز

بُک گیلری، پبلی کیشنز ڈویژن

سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی۔ 110003

پبلی کیشنز ڈویژن، ہال نمبر 196

اولڈ سکریٹریٹ۔ دہلی۔ 110054 فون: 011-23890205

ایم ایل اینڈ سنس

شیواجی اسٹیڈیم کمپلیکس، بھگت سنگھ مارگ، نئی دہلی۔ 110001

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ 110006 فون: 011-23260668

شمسی بک ڈپو

بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

ظہیر الدین نیوز پیپر ایجنٹ

نزد غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔ 110013

فون: 9818593958

سراج نقوی

حسن مثنیٰ: ایک دریا جو سمندر میں اتر گیا

مشہور شاعر احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

برادر عزیز حسن مثنیٰ نے گزشتہ 25 نومبر کو زندگی کی آخری سانس لی اور اس سمندر میں اتر گئے کہ جو اس حیات ظاہری کے بعد ہر ایک ذی روح کا مقدر ہے۔ لیکن سمندر میں اترنے والے ہر جاندار کو دریا ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوتا۔ موت کے اس سمندر میں اترنے والوں میں زندہ وہی رہتے ہیں کہ جو اپنی ذات کو قطرے سے دریا میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں اور بلند شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ حسن مثنیٰ بھی ایک ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے بہت کم وقت میں اردو تحقیق، تنقید و تالیف کے میدان میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ جن کے سبب انھیں یاد رکھا جائیگا، جو اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک دریا کی مانند تھے۔ جنھیں ناموران اردو ادب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا اور جنھوں نے خود بھی درس و تدریس کے پیشے سے وابستگی کے دوران باصلاحیت شاگردوں کی ایک کھیپ تیار کی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا سے وابستگی کے دوران جو لوگ میرے دل کے بھی بہت قریب رہے ان میں حسن مثنیٰ کا نام بہت نمایاں ہے۔ وہ کئی برس تک اخبار مذکورہ میں بحیثیت سب ایڈیٹر خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی گفتگو، ان کی تحریریں اور ادبی موضوعات پر ان کی گرفت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ صحافی سے کہیں زیادہ ایک اچھے ادیب ہیں۔ اس کا ثبوت اس وقت ملا کہ جب انھوں نے اخبار کی ملازمت ترک کر کے درس و تدریس کے شعبے کی طرف رخ کیا اور رانچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہو گئے۔ لیکن یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور میرے تئیں محبت کا ہی ثبوت تھا کہ ان ظاہری فاصلوں کے باوجود ان سے میرا رابطہ بھی برقرار رہا اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کو کتابی شکل میں دیکھنے اور جاننے کا بھی موقع ملا۔ حسن مثنیٰ سے اکثر میری فون پر بات ہوتی تھی۔ ہمیشہ ان کے لہجے میں وہ احترام ہوتا تھا کہ جو کسی مہذب اور اعلیٰ گھرانے میں چھوٹے بھائیوں کے ذریعہ بڑے بھائیوں کو دیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ 'سہارا' سے ان کی علیحدگی کے بعد ان سے ملاقات بہت کم ہوئی لیکن فون پر رابطے نے کبھی ان سے دوری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ انتقال سے چند ماہ قبل بھی ان سے ایک اہم مسئلے پر بات ہوئی اور اس میں ان کی بیماری کا بھی ذکر آیا۔ اس گفتگو کے بعد سے ہی میں ان کے تعلق سے فکرمند ہو گیا۔ ان کی صحت یابی کے لیے دعا بھی کرتا رہا لیکن مرضئ خدا کے آگے کس کا زور چلا ہے۔

حسن مثنیٰ نے اپنی مختصر زندگی میں جو علمی و ادبی کارنامے انجام دیے وہ ہماری نئی نسل کے لیے یقیناً باعث رشک بھی ہیں اور قابل تقلید بھی۔ تنقید و تحقیق سے متعلق ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور اپنے موضوعات کی انفرادیت کے سبب علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں ان کی مرتب کردہ ہیں لیکن ان کتابوں میں بھی خود انھوں نے موضوع سے متعلق اپنے مضامین شامل کر کے اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ 'انیس اور انیس شناس' ایک ایسی ہی کتاب ہے۔

دو ابواب پر مشتمل یہ کتاب 2013 میں منظر عام پر آئی۔ پہلے باب میں میر انیس کی مرثیہ نگاری کے مختلف پہلوؤں پر تحریر کیے گئے مشاہیر ادب و تنقید کے 18 مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسرا باب انیس شناسوں کی انیس شناسی کے حوالے سے تحریر کیے گئے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں 19 مضامین شامل ہیں۔ پہلے باب میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شارب ردولوی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پروفیسر سید محمد عقیل، علامہ عقیل الغروی، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر تقی عابدی، سید مظفر حسین برنی، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر علی محمد صدیقی، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر حسن عباس اور مولانا رئیس احمد جارچوی کے مضامین کے علاوہ خود حسن مثنیٰ کے بھی دو مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ 'اعتراف' سے تحریر کیا گیا پیش لفظ بھی ان کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ اس میں انھوں نے مرثیے کی عظمت و ادبی برتری پر بہت مختصر لیکن بامعنی، پرمغز اور مدلل بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہمارے یہاں'' بگڑا شاعر مرثیہ گو'' (ایسا شاید انشا اللہ خاں انشا نے احساس کمتری کی وجہ سے کہا ہو تو بعید از قیاس نہیں کہ غالب نے بھی اس صنف ادب کو بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور انیس کے مداح بن گئے تھے) کی کہاوت کو کچھ اس طور پر عام کر دیا گیا کہ ایک نہایت توانا صنف ادب بعض مشاہیر کے لیے سرمایہ افتخار نہ بن سکی۔ جب کہ اس صنف ادب نے نہ صرف زبان اردو کو صحت الفاظ، محاورات و روزمرہ وغیرہ صنائع و بدائع سے مالا مال کیا بلکہ اردو ادب کو بھی رزمیہ کے حوالے سے لائق درخور اعتنا بنا دیا، کیونکہ مختلف اصناف نظم کی کثرت کے باوجود اردو زبان اس معاملے میں ابتدا سے ہی تہی داماں تھی۔ کیا میر ببر علی انیس کے مرثیوں (رزمیوں) سے قبل ہمارے یہاں ہومر کی 'ایلیڈ'، ورجل کی 'اینیاڈ'، فردوسی کے 'شاہنامہ'، ویاس کے 'مہابھارت'، والمیکی کے 'رامائن'، نظامی کے 'سکندرنامہ' یا اسی قسم کے دیگر شہ پاروں مثلاً 'گم شدگی بہشت' (paradise lost) اور ''بازیافت بہشت'' (paradise regained) کے مقابلے کی کوئی چیز موجود تھی۔ نہیں، قطعی نہیں، یہ کمی صنف مرثیہ نگاری نے ہی پوری کی۔ جس میں میر انیس (سید ببر علی رضوی) کا اپنا حصہ ہے۔''

مذکورہ مختصر پیراگراف میں صاحب مضمون نے جس بیباکی سے انشا کی مرثیہ نگاری کے تعلق سے رائے پر تبصرہ کیا ہے اور جس طرح میر انیس کے مرثیوں کو عالمی سطح کی رزمیہ شاعری کے

A101، فرسٹ ایونیو، اہنسا کھنڈ سیکنڈ، نزد شانتی گوپال ہاسپٹل، اندرا پورم، غازی آباد
فون: 09811602330 sirajnaqvi08@gmail.com

مقابلے پر رکھ کر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اس سے ان کے تنقیدی شعور اور تحقیقی نگاہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'اعتراف' کے عنوان سے تحریر کیے گئے مذکورہ مضمون یا پیش لفظ کے علاوہ اسی باب میں حسن مثنیٰ کے تین دیگر مضامین بھی شامل ہیں۔ ان میں ایک مضمون ''مراثی انیس اور جنگ کربلا کے اسلحے'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مضمون دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ اس مضمون میں انھوں نے انیس کے فن سپہ گری کے تعلق سے امجد علی اشہری، نیر مسعود اور استاد سید سخی حسن امروہوی کی تحریروں سے حوالے پیش کیے ہیں۔ اسی ضمن میں مصنف ''موازنہ انیس و دبیر'' مولانا شبلی نعمانی کا رزمیہ شاعری کے تعلق سے نقطہ نظر بھی پیش کیا گیا ہے۔ خود صاحب مضمون نے کربلا کی جنگ میں شمشیر، تیر و تبر اور نیزہ جیسے اسلحہ کا ذکر انیس کے مرثیوں کے حوالے سے کرتے ہوئے ان کے استعمال سے متعلق بند اور انیس کی شاعرانہ مہارت کو بھی واضح کیا ہے۔ جنگی گھوڑے، تیغ کا قبضہ، انداز حرب و ضرب کے علاوہ اس جنگ کے اعصابی پہلو پر خاص طور سے جو بحث ہے وہ صاحب مضمون کی گہری نگاہ اور تنقیدی شعور کی عکاس ہے۔ اس اعصابی جنگ میں بھی امام عالی مقام نے جس طرح فوج مخالف کو شکست فاش دی اس کا باریکی سے تجزیہ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون مراثی انیس میں ماں کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں جناب ام البنین، جناب زینب، جناب قاسم کی ماں یعنی بیوہ امام حسن، مادر جناب علی اکبر اور مادر حضرت علی اصغر یعنی جناب رباب کے کرداروں پر میر انیس کے مراثی کے حوالوں سے مدلل بحث کی ہے اور ان کرداروں کا مختصر الفاظ میں نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔

اسی باب میں حسن مثنیٰ کا تیسرا مضمون ''مراثی انیس میں انسان سازی کے عناصر'' عنوان سے ہے۔ یہ مضمون اس اعتبار سے بیحد اہم ہے کہ واقع کربلا کا سب سے اہم پہلو بلکہ سب سے اہم پیغام ہی انسانیت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بقا ہے۔ کربلا حسین اور یزید کی جنگ نہیں بلکہ حق و باطل کی جنگ ہے۔ اس جنگ نے قیامت تک کے لیے باطل کے چہرے کو بے نقاب کرنے کا جو عظیم ترین کارنامہ انجام دیا اسی کے سبب اس کی افادیت اور اہمیت بلا تفریق مذہب و ملت بڑھ جاتی ہے۔ اسی لیے دنیا کے تمام بڑے دانشوروں، مفکروں اور حق پرستوں نے امام حسین کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ میر انیس نے اپنے مرثیوں میں کربلا کے اس انسانی پہلو کی عکاسی بہت موثر انداز میں کی ہے۔ حسن مثنیٰ نے اپنے مضمون میں انیس کے مرثیوں کے اس پہلو کی بازیافت ناقدانہ نقطہ نظر سے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''اس میں (یعنی صنف مرثیہ میں) انسان سازی کے اہم ترین عناصر مثلاً شجاعت و سخاوت، اطاعت و فرمانبرداری یا عفو و کرم، احسان شناسی، حسن سلوک، صلہ رحمی، مہر و وفا، صبر و رضا، جذبہ اتحاد و یگانگت، حلم و بردباری، یا کہ سپاس گزاری اور انکساری وغیرہ بھی بکھرے پڑے ہیں۔ انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قلمرو میں ایسے ایسے جواہر پارے جمع کر دیے کہ اس کے مطالعے کے وقت ہم پر چودہ طبق روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔'' اسی مضمون میں آگے لکھتے ہیں ''میری نظر میں مرثیہ نگاری صرف شاعری نہیں ہے، مذہب کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ اسے ایک اخلاقی صحیفہ کہا جانا چاہیے، کیونکہ اس میں اخلاق سازی و کردار سازی کا ایسا نظام نظر آتا ہے جو صرف اسی صنف سخن کا حصہ ہے۔'' حسن مثنیٰ نے انیس کے مراثی کے حوالوں سے انسانی اقدار و اخلاق کے جن پہلوؤں کو امام حسینؑ اور ان کے رفقا میں تلاش کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ کربلا کسی خاص مذہب و مسلک کے پیروکاروں کے لیے ہی درس نہیں ہے بلکہ اس واقعہ میں انسانیت کے وہ اخلاقی و تہذیبی پہلو بھی شامل ہیں جن کی ضرورت ہر دور کے سماج و معاشرے کو رہی ہے۔ انیس نے اپنے مرثیوں میں ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور حسن مثنیٰ نے ان کی نشاندہی کرنے کا کام بخوبی کیا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب انیس شناسوں کے تعلق سے لکھے گئے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس باب میں بھی کئی اہم ادیبوں اور نقادوں کے مضامین شامل ہیں۔ حسن مثنیٰ کے بھی تین مضامین اس باب میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون ڈاکٹر شارب ردولوی کی انیس شناسی پر ہے، جبکہ دوسرے مضمون میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی انیس شناسی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ تیسرے مضمون میں انیس کی شخصیت کو ناقدین کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ تمام مضامین خود حسن مثنیٰ کی ناقدانہ صلاحیت اور محققانہ وسعت نگاہ کا ثبوت ہیں۔ شارب ردولوی کی انیس شناسی پر تحریر کیے گئے مضمون میں حسن مثنیٰ نے شارب صاحب کی ناقدانہ صلاحیتوں اور ان کی انیس شناسی کو سمجھنے میں جس استدلال کا مظاہرہ کیا ہے اس سے خود ان کی تجزیہ نگاری کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شارب صاحب کی اہم تنقیدی کاوش ''مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''اگر ڈرامے کے عناصر ترکیبی میں suspence یا کشمکش، تصادم اور اتحاد زمان و مکان کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے تو مراثی میں بھی ایک واقعاتی تسلسل پایا جاتا ہے۔ یہاں بھی کشمکش کی ایک فضا ہوتی ہے، حق و باطل کا تصادم پیش نظر ہوتا ہے جو سامعین کو باندھے رہتا ہے۔'' شارب ردولوی کی مذکورہ کتاب کے علاوہ مرثیے پر ان کی دیگر کتب ''اردو مرثیہ''، ''مرثیہ اور مرثیہ نگار'' وغیرہ کا بھی جائزہ انیس شناسی کے حوالے سے لیا گیا ہے۔

دوسرا مضمون ضمیر اختر نقوی کی انیس شناسی کا احاطہ کرتا ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے 1971 میں پاکستان میں ''میر انیس اکیڈمی'' قائم کر کے انیس شناسوں کو جو پلیٹ فارم مہیا کرایا وہ یقیناً ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس اکیڈمی نے انیس شناسی کے میدان میں کافی کام کیا۔ لیکن ضمیر اختر نے انیس شناسوں کو صرف ایک پلیٹ فارم ہی مہیا نہیں کرایا بلکہ انھوں نے خود بھی انیس اور ان کی شاعرانہ عظمت کو مختلف جہتوں سے سمجھنے اور اہل نظر کو سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی ان کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے حسن مثنیٰ نے ضمیر اختر نقوی کے ایک مضمون کا ایک اہم اقتباس نقل کیا ہے، جو ضمیر اختر نقوی انیس شناسی کے باب میں بیحد اہم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس، ''جس نے میر انیس کو نہیں پڑھا وہ شاعری نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میر انیس کے مرثیے بیک وقت غزل، نظم، حزنیہ، رزمیہ، طربیہ، اور رثائیہ شاعری کا مرقع ہیں۔ میر انیس کو پڑھنے اور سننے کے بعد شاعری کی حس تخلیق متحرک ہو جاتی ہے۔'' ضمیر اختر نقوی کے مذکورہ اقتباس کے علاوہ بھی موصوف کی انیس شناسی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے حسن مثنیٰ نے مدلل انداز میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

انیس شناسوں سے متعلق حسن مثنیٰ کی تیسری تحریر میں ان تمام انیس شناسوں کے انیس کی مرثیہ نگاری سے متعلق چند اہم اقتباسات پیش کیے گئے ہیں کہ جن کے انیس شناسی پر تفصیلی مضامین بھی اسی باب میں شامل ہیں، لیکن ان شخصیات کے علاوہ بھی انیس شناسوں کی ایک بڑی تعداد کی مختصر آرا کو اس مضمون میں پیش کر کے انیس اور انیس شناسوں کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس فہرست میں مولانا محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، غالب، شیفتہ، واجد علی شاہ، سید احتشام حسین، عبد السلام ندوی، احسن فاروقی، افضال حسین، مرتضیٰ حسین، سید عابد علی، نوبت رائے نظر، امداد امام اثر، مسعود حسن رضوی ادیب، اکبر حیدری کاشمیری، امیر احمد علوی، محمد یحییٰ تنہا، شجاعت علی سندیلوی، رئیس امروہوی، مہذب لکھنوی، جوش ملیح آبادی، سلام سندیلوی، عبد الرؤف عروج، محی الدین زور، سید امجد علی، فیض احمد فیض، عبد الحئی، اعجاز علی ارشد، ابو اللیث صدیقی، عبد الحلیم شرر، رام بابو سکسینہ، صفدر حسین، سید نظیر الحسن فوق، سردار جعفری، آل احمد سرور، سیدہ جعفر جیسی شخصیات کی مختصر آرا کو شامل کیا گیا ہے۔ ہر چند کہ اس مضمون میں کسی بھی رائے پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ہے لیکن اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کی روشنی میں انیس شناسوں کی بڑی تعداد سامنے آتی ہے۔

بہر حال اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حسن مثنیٰ نے اپنی مختصر زندگی میں ہی جو ادبی اور تحقیقی کارنامے انجام دیے وہ مختصر نہیں ہیں۔ مذکورہ کتاب ان کی کاوشوں کا ایک مختصر حصہ ہے لیکن بلا شبہ انھوں نے اپنی ادبی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا جس طرح سے لوہا منوایا اس کے سبب انھیں علمی و ادبی حلقوں میں یاد رکھا جائے گا۔

☆☆

غزلیں

کرشن گوتم

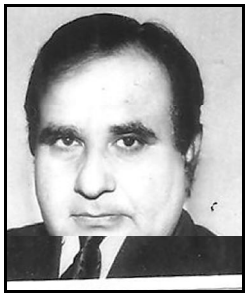

یہ سال

اکیسویں صدی کا ہے انیسواں یہ سال
اک نوجواں صدی کا ہے اک نوجواں یہ سال

وہ رہ گزارِ وقت پر چھوڑے نشاں یہ سال
پھر سے بنے ہندوستاں رشکِ جہاں یہ سال

بھٹکے دلوں کے واسطے ہو کارواں یہ سال
سب چاہنے والوں کو لطف بے کراں یہ سال

روندا ہے اپنے قدموں سے ہم نے ہی چاند کو
ہے حوصلے والوں کے لیے آسماں یہ سال

خودغرضیاں بنتی ہیں کشت وخون کا سبب
ہو کاش! سب کے واسطے آرام جاں یہ سال

چلتی ہیں تندوتیز ہوائیں چار سو
نوخیز کلیوں کے لیے ہو باغباں یہ سال

تقلید گاندھی جی کی اگر ہر کوئی کرے
لائے گا کل جہاں میں دورِ شادماں یہ سال

امدادِ باہمی سے ترقی سبھی کی ہے
اہل وطن کے واسطے ہو پاسباں یہ سال

دنیا میں دوڑے پھرتے ہیں آفت کے فسادی
بن جائے ان کی راہوں میں کوہِ گراں یہ سال

فرقہ پرستیوں کے یہ خاروخس وخاشاک
ہو ان کے کیے ہیبت سیل رواں یہ سال

ناسازگار وقت میں گوتم ! نہ ہو ملول
ہر اہل دل کے واسطے ہے مہرباں یہ سال

3251، سیکٹر D-44، چنڈی گڑھ
فون:09592593636

ضیاء فاروقی

آخرِ شب جاگتا ہوں جب مہ وانجم کے ساتھ
کیوں ستم کرتا ہے میرا رب مہ وانجم کے ساتھ

ایک سورج کے نکلتے ہی مری آنکھوں کے خواب
خاک ہو جاتے ہیں جل کر سب مہ وانجم کے ساتھ

ان کو اب دیکھوں تو صحرا کا گماں ہونے لگے
مسکراتے تھے کبھی جو لب مہ وانجم کے ساتھ

وہ تو یہ کہئے کہ پھر سورج نے آنکھیں کھول دیں
ورنہ آتا ہی کہاں یہ ڈھب مہ وانجم کے ساتھ

جب یہاں گردش میں تھی چاروں طرف پاگل ہوا
ہم بھی تھے اس دشتِ شب میں تب مہ وانجم کے ساتھ

بعد مدت کے مری آنکھوں نے دیکھا کوئی خواب
بعد مدت کے گزاری شب مہ وانجم کے ساتھ

ہجر کی ہر ایک شب میں ایسا لگتا ہے ضیاؔ
میرا رشتہ ہی نہیں ہے اب مہ وانجم کے ساتھ

معرفت ایم ایچ کے آئی ٹی سی، رفیقیہ اسکول روڈ، بھوپال۔1
فون:09406541986

عبدالسلام عاصم

جس جگہ جو خوش نشیں آیا نظر رہنے دیا
ہم نے روشن دان میں چڑیوں کا گھر رہنے دیا

مل کے جو بچھڑے اُنہیں جانے سے روکا بھی نہیں
اور جو ساتھ آئے اُن کو ہم سفر رہنے دیا

دردِ دل کو بھی دواؤں سے ہی بہلاتے رہے
بد دعاؤں کو ہمیشہ بے اثر رہنے دیا

جس کے ڈر کی کرتے پھرتے ہیں تجارت اہل دیں
ہم نے اُس کے خوف سے لرزیدہ شرر رہنے دیا

ہر صبح تجھکو بھلانے کے لئے دفتر گیا
اور تری یادوں کو مہماں رات بھر رہنے دیا

جس میں ہاتھوں کو مرے تھامے نظر آتے ہو تم
بس اُسی تصویر کو دیوار پر رہنے دیا

سب بدل کر رکھ دیا ہم نے اِن آنکھوں کے لئے
ہاں مگر منظر بہ منظر چشمِ تر رہنے دیا

S-92، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی۔110025
فون:09891661256

غـــــزلـــــیں

نیاز سلطانپوری

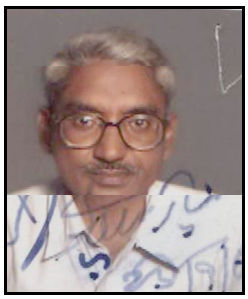

حال زبوں سنائے کیوں، زخم جگر دکھائے کیوں
دوش پہ ناتواں کوئی بار الم اٹھائے کیوں

لاکھ وہ پرفتن سہی، لاکھ وہ دل شکن سہی
جس کو زیاں کا خوف ہو اس کے قریب جائے کیوں

لاکھ وہ بے وفا سہی، لاکھ وہ بیسوا سہی
صاحب عقل و ہوش و دل، دام میں اس کے آئے کیوں

جس کو انا کا پاس ہو، جس کا غنا لباس ہو
ایسا فقیر بے نوا، دست طلب بڑھائے کیوں

عشق میں وہ تڑپ نہیں، چاہ نہیں، طلب نہیں
ایسے میں وہ حریم ناز رخ سے نقاب اٹھائے کیوں

قدرِ سخن نہ ہو جہاں، جہل خرد ہو حکمراں
شعر و ادب کا ترجماں، بزم میں ایسی جائے کیوں

جس کا قدم ہو فرش پر، جس کی نظر ہو عرش پر
راہ میں اس کی اے نیاز، غم کا پہاڑ آئے کیوں

بھٹی جرولی، کٹاواں، سلطانپور۔228001
فون:08756228058

نسیم عزیزی

ذرا سی بات کیا نکلی ترے حسنِ مجسّم کی
جبیں پر بل پڑے، تیرے ثنا خوانِ معظّم کی
اگر رسوائی و ذلّت ہی قسمت سعیِ پیہم کی
ہوا کیوں چاہتی ہے پھر تباہی ایک عالم کی
ہم آئینے سے نالاں تھے، چراغِ دل نہ بن پائے
سرِ جشنِ پذیرائی، ذرا جو آنچ، کیا کم کی!
اسی کا سحر ہے طاری، وہی فرزانگی جاری
کہیں گل پیرہن پیکر، کہیں تصویرِ ماتم کی
رگِ جاں میں سلگ اٹّھا کوئی لمحہ مَسرّت کا
گھٹائیں کیوں سناتی ہیں کہانی سَطوتِ غم کی
سکوتِ زخم کا لہجہ، مُنوّر ہوگیا تھا کیا؟
لرز اٹّھی تھی کیوں آواز اپنے شاہِ عالم کی؟
لپٹ کر اس کے سائے سے، نہ جانے کب کے سوئے تھے
نگارِ گُل چمک اٹّھے کھلی جو آنکھ شبنم کی
خوشی کہنے لگی غم سے ترا جو حال میرا حال
کبھی قسمت تری چمکی، کبھی قسمت مری چمکی
نگاہِ عشق میں دل کی اہمّیت نسیم اتنی
وہی زنجیرِ آہن بھی، وہی ڈوری ہے ریشم کی

172 جی ٹی روڈ (ساؤتھ)، ہوڑہ-711102
فون:9433627707

شفاعت قلندر

جہاں میں تیری سخت کمی ہے
آنکھوں میں میرے بہت نمی ہے

نہیں جہاں سے مجھے ہے رغبت
گرد مری کھو میں یہ جمی ہے

رہی نہ صحت رہی نہ دولت
جیسی تھی حالت ابھی وہی ہے

گزر ہو کیسے میں سوچتا ہوں
یہ زندگی میری اجنبی ہے

گزرتے لمحات ہیں اکیلے
نہیں کسی سے بھی دوستی ہے

یہ پل جہاں سے کیسے چلے گا
فقط مجھے دیکھنی گھڑی ہے

میں تو یہاں ہوں وہ تو کہیں ہے
بغیر اس کے نہ نیند بھی ہے

یہ زندگی کچھ بھی تو نہیں ہے
مایوسی ہرسو یہ زندگی ہے

جہاں میں خوشی نہیں ملے گی
تجھے شفاعت، نہیں خوشی ہے

علمدار کالونی اے، لال بازار، سرینگر۔190023

غـــــزلـــیں

محمد سلیم نثار

مرے قریب سے گزرا تو ڈر لگا ایسا
وہ اجنبی تو نہیں تھا مگر لگا ایسا

نظر اٹھانے کے انداز کا بیاں کیا ہو
کسی کو ہو نہیں پائی خبر لگا ایسا

جو تیرے بعد بھی لوگوں کو اپنا سایہ دے
لگا رہا ہے اگر تو شجر لگا ایسا

گزرتے وقت کا ہم ساتھ دے نہیں پائے
کبھی یہ شام کبھی یہ سحر لگا ایسا

تمھیں فرار سے حاصل نثارؔ کیا ہوگا
کہ زندگی سے کہاں ہے مفر لگا ایسا

C-16، مدنی نگر، سیدواڑی، وٹوا،
احمد آباد۔382440

مظفر علی شہ میری

جو ہوا ہے، ہو چکا ہے، سر کھپا کر کیا کروگے
دل جلا کر کیا کروگے، غم اُٹھا کر کیا کروگے

رات بھر تم بیٹھے رہنا، بادلوں کی اوٹ ہی میں
شہر اندھوں سے بھرا ہے، جگمگا کر کیا کروگے

جو بنانے جا رہے ہو، درحقیقت قید ہے وہ
تم مسافر دشت کے ہو، گھر بنا کر کیا کروگے

اُن کے کانوں میں کسی نے پگھلا سونا بھر دیا ہے
روز و شب دروازہ اُن کا کھٹکھٹا کر کیا کروگے

اب کہاں وہ موج مستی، کھل کے ہنسنا، مسکرانا
جسم پتھر بن گئے ہیں، گدگدا کر کیا کروگے

اک ذرا سا مسکرا کر دلدہی کردو کسی دن
ہم فقیروں کا ہمیشہ دل دکھا کر کیا کروگے

دل کے زندہ رہنے ہی پر، سر کی عزت ہے مظفر
دل پہ تم نے خاک ڈالی، سر بچا کر کیا کروگے

وائس چانسلر، ڈاکٹر عبدالحق اُردو یونی ورسٹی، کرنول
آندھرا پردیش shahmiri53@gmail.com

عمران راقم

تیری نظر کا آج اتارا تو ہے کوئی
اس شہر میں نصیب کا مارا تو ہے کوئی
چہرے پہ لاکھ درد کے روشن چراغ ہوں
سو جان تجھ پہ آج بھی وارا تو ہے کوئی
بوسہ دیا تھا تم نے جو وہ یاد آگیا
روشن مری جبیں پہ ستارا تو ہے کوئی
انگلی سے لکھ رہا ہے کسی بے وفا کا نام
ساحل پہ اپنی زیست کو ہارا تو ہے کوئی
شانے پہ سر کو رکھ کے سناتے ہو حالِ دل
دنیا میں راز دار تمہارا تو ہے کوئی
دل پہ حصارِ یاد سے باہر نہیں تو کیا
آنکھوں میں بے خودی کا نظارا تو ہے کوئی
محسوس جب کروگے تو آئے گا یہ خیال
جس کے سہارے ہوگا گزارا تو ہے کوئی
مانا کہ بے وفا ہے مگر اتنا ہے کرم
بے نام زندگی کا سہارا تو ہے کوئی
میں جی رہا ہوں کس کے سہارے پتہ نہیں
لیکن میری حیات میں یارا تو ہے کوئی
جان و جگر ہے جس کے حوالے مرا یہاں
واللہ میری آنکھ کو پیارا تو ہے کوئی
مانا کہ موج دریا بہت زور پر ہے آج
راقمؔ بھنور کے بیچ شکارا تو ہے کوئی

3، گرانٹ اسٹریٹ (فرسٹ فلور)، کولکاتا۔13
فون:9163916117

احمق

شموئل احمد

''**برف** آیا؟''

''جی آیا''

''کہاں ہے''

''چولہے پر....''

''ایسی تو احمق ہے....لیکن کیا کروں؟ پھوپھی جان مرتے مرتے اس کا ہاتھ تھما گئیں۔تب سے جھیل رہی ہوں۔''

اور مجھے باجی کی یہی بات پسند نہیں ہے۔پندرہ سال قبل ننھی بچّی کی زبان سے پھسلی ہوئی بات کو گرہ سے باندھ لینا اور وقتاً فوقتاً مذاق اڑانا کہاں کا شیوہ ہے؟ تب سریہ کی عمر ہی کیا تھی ؟محض چار سال...! گھر میں برف آیا تھا۔اماں نے پوچھا برف کہاں رکھا ہے تو سریہ جھٹ بول اٹھی تھی چولہے پر۔سبھی محظوظ ہوئے تھے۔اباٹھہا کہ مار کر ہنسے تھے۔اماں گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی تھیں۔یہ واقعہ سب کو یاد تھا لیکن کوئی دہراتا نہیں تھا۔ایک باجی تھیں کہ جیسے بات پکڑ رکھی تھی.....''ایسی تو احمق ہے.....''

اور اسی احمق نے باجی کا گھر سنبھال رکھا تھا۔

سریہ جب چھ سال کی تھی تو پھوپھی جان داغ مفارقت دے گئیں۔پھوپھا پہلے ہی گزر گئے تھے۔سریہ یتیم ہوگئی۔ ماموں نے اپنے پاس رکھ لیا۔جب باجی کی شادی ہوئی اور گھر بسا تو سریہ کو اپنے پاس بلا لیا۔تب وہ دس سال کی تھی لیکن اس عمر میں بھی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی تھی۔شروع شروع میں باجی نے جھاڑو برتن کے لئے ملازمہ رکھا تھا لیکن سریہ کچھ اور بڑی ہوئی تو ملازمہ کو برطرف کر دیا۔سارا کام سریہ ہی دیکھنے لگی۔

''سریہ چائے نہیں ملی ابھی تک۔''

''سریہ بٹن ٹانک دے۔''

''سریہ مچھلی دھو کر فریج میں رکھ دیجیو۔ابھی مرغی کا سالن بنایئو،

''سریہ میرے جوتے میں پالش نہیں ہے۔''

سریہ مشین میں کپڑے لگا دے۔آج چادر بھی دھلے گی۔''

''سریہ ابھی تک گھر میں جھاڑو نہیں پڑا''

سریہ''

سریہ''

''سریہ''

اور سریہ صبح سے شام تک گھر میں گھرنی کی طرح ناچتی رہتی۔کبھی دوڑ کر ادھر....کبھی دوڑ کر ادھر....سب کی جھڑکیاں بھی سنتی۔

''اتنی دیر کہاں لگا دی؟''

''چائے میں تو چینی ہی نہیں ہے۔''

''برتن اسی طرح دھویا جاتا ہے؟ دیکھ یہاں داغ لگا ہے۔''

''نکمّی....کام چور۔''

''ایک دم پاگل ہے کمبخت۔''

ایک نوشے بھائی تھے کہ سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے اور گال تھپتھپاتے۔

باجی کے ساتھ رہتے ہوئے اسے دس سال ہو گئے تھے۔وہ اس بات پر نازاں تھی کہ باجی اس کی اپنی ماموں زاد بہن تھیں ۔ وہ فخر سے جتاتی ....'' میری سگّی ممیری بہن ہیں....سگّی...سگّی کا لفظ زور دے کر ادا کرتی....ایک ہاتھ سینے پر ہوتا۔آنکھیں باہر کی طرف پھیل جاتیں اور پیشانی پر لکیریں سی پڑ جاتیں۔لیکن 'سگی' کو گوارہ نہیں تھا کہ کمبخت ہر جگہ رشتے کا بکھان کرے۔خصوصاً اس وقت جب گھر میں کوئی مہمان آتا تو باجی کے لیے یہ بات برداشت سے باہر ہوتی کہ سریہ ان کے درمیان بیٹھ کر گفتگو میں حصہ لے۔اور یہ اس کی عادت تھی۔گھر میں کوئی آتا تو میز پر ناشتے کی ٹرے رکھ کر کونے میں کھڑی رہتی ۔ باجی اسے گھورتیں اور وہاں سے ہٹنے کے اشارے کرتیں۔ایک بار کسی نے ٹوک دیا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟''

اس سے پہلے کہ باجی کچھ کہتیں سریہ اپنے مخصوص انداز میں بول اٹھی۔

''باجی میری سگّی ممیری بہن ہیں....سگّی....!''

'' معاف کرنا....میں اسے نوکرانی سمجھ رہی تھی۔''

''ماموں جان نے مجھے گود لیا ہے۔پھر باجی نے اپنے پاس رکھ لیا۔''

مہمان کے جانے کے بعد باجی نے اس کے کان کھینچے۔

''بہت زبان کھل گئی ہے تیری....ہزار بار سمجھایا کہ کوئی آئے تو سر پر کھڑی مت رہ لیکن احمق کے پلّے کوئی بات نہیں پڑتی۔''اور دو چار تھپّڑ جڑ دیئے۔

سریہ بالکنی میں گئی اور مڈّی کو لپٹا کر رونے لگی۔مسلسل سسکیوں کے درمیان الفاظ گھٹ گھٹ کر نکل رہے تھے اور آنسو رخسار پر ڈھل رہے تھے۔

''بتاو مڈّی....میں نے کیا غلط کہا....؟ باجی میری سگّی ممیری بہن ہیں کہ نہیں؟''

مڈّی اس کی واحد دوست تھی۔اس کی ہم دم....اس کی ہمراز۔وہ جب بھی تناؤ میں ہوتی مڈّی کو لپٹا کر روتی اور اپنا دکھڑا شیئر کرتی۔

چار سال قبل نوشے بھائی دوبئ گئے تھے تو وہاں سے اس کے لیے ایک بڑی سی باربی ڈال لے کر آئے تھے۔ڈال کی آنکھیں بلّوری تھیں اور بال سنہرے۔ ہونٹ سرخ سرخ.....اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔سریہ تو نہال ہو گئی۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ گڑیہ اس کے لیے آئی ہے۔لیکن نوشے بھائی نے سر پر ہاتھ پھیرا ۔

''اس کا نام کیا رکھو گی۔؟''

''نام....؟''سریہ نے ایک پل سوچا پھر جھٹ سے بولی۔

''مڈّی....!''

''واہ...!اچھا نام ہے۔''نوشے بھائی مسکرائے۔

اس دن سے وہ تھی اور مڈّی تھی۔پہلی بار اس نے مڈّی سے بات کی تو بولی تھی۔

''باجی میری سگّی.....''

لیکن باجی نے مڈّی کے ساتھ اس کی والہانہ گفتگو کو'' بھنر بھنر'' کا نام دیا تھا

مڈّی سے اس کو بات کرتے ہوئے دیکھتیں تو ڈپٹ دیتیں۔

''کیا ہر وقت بھنر بھنر کرتی رہتی ہے۔؟''

سریہ ڈر جاتی اور مڈّی کو جلدی سے بکس میں چھپا

پلر نمبر 177، اپر پلی 201، للّی بلوسوم اپارٹمنٹ،
نزد ایس ڈی آر پیرل پلیس، حیدر آباد۔500048
فون:9835299303

دیتی۔اس کے پاس ٹین کا بڑا سا بکس تھا جو ماں سے وراثت میں ملا تھا۔سریہ کی دنیا اس میں سمائی ہوئی تھی۔مڈّی کو بکس میں کپڑے کی تہوں کے اندر رکھتی۔مڈّی کے لیے اس سے زیادہ محفوظ جگہ دوسری نہیں ہوسکتی تھی۔اس کو جب بھی کام سے فرصت ملتی گڑیہ سے باتیں کرتی۔اس کے بال سنوارتی گھر کا قصّہ بیان کرتی۔کون آیا کون گیا۔کس کو ڈانٹ پڑی۔کبھی کبھی اتنا کھو جاتی کہ ہوش نہیں رہتا کہ کام ادھورے پڑے ہیں۔ایک بار سالن چڑھا کر بھول گئی۔سارا سالن جل گیا۔باجی نے کئی تھپّڑ لگائے۔گڑیہ چھین کر الماری میں بند کر دی۔سریہ کا روتے روتے برا حال ہوگیا۔شام تک بھی گڑیہ نہیں ملی تو اس نے باجی کے پاؤں پکڑ لیے۔باجی نے تنبیہ کی کہ آئندہ غفلت برتے گی تو گڑیا سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

سریہ حساب کی کچّی تھی۔اس کو دس سے آگے کی گنتی نہیں آتی تھی۔باجی کہتی تھیں ''اس کا مینٹل گروتھ'' نہیں ہوا ہے۔کسی کام کی نہیں ہے یہ لڑکی سوائے اس بات کے کہ اس سے گھر کا کام لیا جائے۔اور وہ ہر طرح کا کام لیتی تھیں۔سودا سلف لینے باہر نہیں بھیجتی تھیں لیکن خود بازار جاتیں تو اس کو ساتھ لے لیتیں۔سبزیاں خریدنے میں وہ بہت مددگار ثابت ہوتی۔اسے تازہ اور باسی سبزیوں کی تمیز تھی۔ایک بار باجی پرول لینا چاہ رہی تھیں تو اس نے منع کیا تھا کہ پرول رنگے ہوئے ہیں۔

سریہ کی زبان سے اکثر بے ربط جملے نکل جاتے تھے۔ایک بار باجی کو چھینک آئی تو اس کے منھ سے برجستہ نکلا۔

''اللہ خیر....میری عمر آپ کو لگ جائے.....''

باجی چڑ گئیں۔

''کمبخت.... بولنا چاہیے الحمدللہ تو عمر کی دعائیں مانگتی ہے۔کیا سمجھتی ہے ایک چھینک سے مرجاؤں گی۔''

اور باجی کو متواتر کئی چھینکیں آئیں۔

چل دور ہو میری نظروں سے....''

اور باجی کو نزلہ ہوگیا....پھر وائرل بخار....! سرسامی کیفیت ہوگئی۔زور زور سے چیخنے لگیں

''کل جبھی ہے کمبخت.....ایک دم کالی زبان ہے اس کی.....میں تو سچ میں مر رہی ہوں....ہائے.....ہائے....!''

سریہ مڈّی سے لپٹ کر خوب روئی۔

''بتاؤ مڈّی....میں باجی کا کبھی برا چاہوں گی؟''

باجی تو جلد اچھی ہوگئیں لیکن سریہ کو ایک اور خطاب مل گیا۔''کل جبھی''۔

سریہ پھر بھی باجی کے نام کی تسبیح پڑھتی تھی۔سگی ماموں زاد بہن جو ٹھہریں۔یہی احساس اسے گھر میں آئے مہمانوں کے ساتھ بیٹھنے کا حوصلہ بخشتا تھا۔لیکن یہی احساس باجی کو الجھن میں مبتلا کرتا تھا۔وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی اسے نوکرانی کی طرح کام کرتے ہوئے دیکھے اور پوچھے کون ہے یہ.....؟

جس دن باجی اچھی ہوئیں اسی دن رشیدہ ملنے آئی۔رشیدہ پرانی سہیلی تھی لیکن خستہ حال تھی۔باجی اس کو چائے کے لیے کم ہی پوچھتی تھیں۔باجی کو دھڑکہ ہوا کہ اپنا جھمکہ لینے تو نہیں آئی ہے؟

دو سال قبل وہ پانچ ہزار روپے قرض مانگنے آئی تھی اور باجی نے انکار نہیں کیا تھا۔اس سے پہلے بھی اس نے ہاتھ پھیلائے تھے تو باجی نے خوبصورت بہانے بنائے تھے۔لیکن اس بار وہ بڑا سا جھمکہ پہن کر آئی تھی اور باجی حیرت میں پڑ گئی تھیں۔ان کی نظر جھمکے پر ٹھہر سی گئی.....جھمکے کا بالائی حصّہ بیضوی تھا جس میں جگہ جگہ رنگین نگینے جڑے ہوئے تھے۔حاشیئے پر جالیاں بنی ہوئی تھیں جن سے لگی لڑیاں جھول رہی تھیں۔باجی کو یاد آیا کسی فلم میں ہیما مالنی کو ایسا ہی جھمکہ پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ان کو حیرت ہو رہی تھی کہ پھکّڑ عورت اتنا قیمتی زیور کہاں سے لائی۔جی میں آیا پوچھیں لیکن ہتک کا احساس ہوا۔سوچا پوچھنے پر اترائیگی۔سریہ اس وقت شوکیس کی ڈسٹنگ کر رہی تھی۔رشیدہ کو دیکھ کر سلام کیا۔

رشیدہ نے جواب میں خیریت پوچھی

''کیسی ہو سریہ۔''

''اللہ خیر....'' سریہ خوش ہوگئی اور ڈسٹنگ چھوڑ کر کونے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

باجی نے گھور کر دیکھا۔وہ اٹھ کر پھر ڈسٹنگ کرنے لگی۔باجی نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

سریہ وہاں سے ہٹ گئی تو رشیدہ نے باجی کو مخاطب کیا۔

''ایک ضروری کام سے آئی تھی۔''

باجی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا.

''چند پیسوں کی ضرورت تھی۔''

ان کی نظر جھمکے پر گئی۔

''کتنا چاہیئے؟''

''پانچ ہزار!''

''جھمکہ تو بڑا خوبصورت ہے....ذرا دیکھوں؟''

''اماں نے دیا تھا۔میرے پاس سارا زیور انہیں کا تو دیا ہوا ہے۔''

رشیدہ نے جھمکہ اتار کر ان کے ہاتھوں میں دیا۔ہتھیلی پر رکھ کر وزن کا اندازہ کیا اور مسکرا کر بولیں۔

''بھاری بھی ہے۔''

''ایک ایک ڈیڑھ بھر کا ہے۔'' رشیدہ بھی مسکرائی۔

باجی اندر گئیں۔آئینے کے سامنے اپنی بالیاں اتار کر ان کی جگہ کانوں میں جھمکہ ڈالا۔ایک دو بار گردن گھما کر اپنے کو دیکھا.....اور یہ سوچ کر مسکرائیں کہ پچاس ہزار سے زیادہ کا ہوگا۔پھر الماری سے پانچ ہزار کی گڈّی نکالی اور رڈرائنگ روم میں واپس آئیں۔رشیدہ کے منھ سے برجستہ نکلا۔

''ماشاءاللہ.....بہت جچ رہا ہے۔''

''میں کچھ دن پہن کر دیکھوں...؟تمہیں کوئی پرابلم تو نہیں....؟'' باجی نے اس کی طرف رقم بڑھائی۔

''نہیں نہیں....کوئی پرابلم نہیں۔'' رشیدہ رقم لیتی ہوئی بولی۔

''شکریہ۔''

''یہ پارٹی جھمکہ ہے۔میں اسے صرف پارٹی میں پہن کر جاتی ہوں۔''

''یہاں کون سی پارٹی ہے جو پہن کر آئی ہو۔'' باجی چڑ گئیں۔

رشیدہ ہنسنے لگی۔وہ زیادہ دیر نہیں رکی۔اس کے جانے کے بعد باجی پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئیں اور اپنے کو کئی بار دیکھا۔

باجی نے جھمکہ لاکر میں رکھ دیا۔کہیں پارٹی میں جاتیں تو پہن کر جاتیں۔انہیں یقین تھا کہ پانچ ہزار کی رقم رشیدہ کے لیے بڑی رقم ہے۔وہ قرض جلدی نہیں اتار سکے گی۔

رشیدہ وقتاً فوقتاً آتی رہتی لیکن جھمکے کا نہیں پوچھا۔باجی نے بھی کبھی پیسے کا تقاضہ نہیں کیا پھر بھی دھڑکا لگا رہتا کہ پتہ نہیں کب واپس مانگ لے۔

آج اچانک رشیدہ کو دیکھ کر وہ چونک گئی تھیں۔وہ خوش حال نظر آرہی تھی۔نئے لباس میں تھی اور پاؤں میں لباس سے میچ کرتی ہوئی نئی چپّل تھی۔کان میں موتیوں والے ٹاپس چمک رہے تھے۔

''بہت دنوں بعد...خیر تو ہے۔'' باجی نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''کچھ گھریلو الجھنوں میں مبتلا رہی.....کہیں آنا جانا نہیں ہوا۔''

رشیدہ کی آواز سن کر سریہ کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی اور رشیدہ کو سلام کیا۔

''کیسی ہو سریہ''۔

''جی خیر اللہ....!'' سریہ خوش ہوگئی۔

باجی نے اسے چائے بنانے کے لیے کہا.

''سریہ لمبی ہوگئی ہے۔''

''اور بیوقوف بھی....کیا بتاؤں جھیل رہی ہوں۔''

باجی نے حسب معمول شکایت کی۔

کیا بات ہے؟ بہت نالاں نظر آرہی ہو۔''

''کل جبھّی ہے کمبخت...اس کی وجہ سے میں بیمار پڑ گئی۔''
باجی نے چھینک والا واقعہ سنایا۔ رشیدہ ہنسنے لگی۔
''چھینک کا عمر سے کیا تعلق؟''
''بتاؤ...کہتی ہے میری عمر آپ کو لگ جائے۔ اور خدا کا کرنا کہ میں بیمار بھی پڑ گئی''۔
''سچ مچ احمق ہے۔'' رشیدہ پھر ہنسنے لگی
''ایک دم گئی گزری ہے۔ جھیل رہی ہوں کہ رشتہ دار ہے۔''
''تم تو ثواب کما رہی ہو۔ آخر یتیم ہے۔ کہاں جاتی؟''
''پھوپھی نے مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ تب سے اسے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اتنی بڑی ہو گئی ہے لیکن مینٹل گروتھ نہیں ہوا۔ ابھی تک گڑیا سے باتیں کرتی ہے۔
''میں آئی تھی تمہیں دعوت دینے۔''
''کیسی دعوت....؟''
''بیٹے کو بینک میں نوکری مل گئی ہے۔ اس نے پہلی تنخواہ ہاتھ میں لا کر دی تو سوچا میلاد کر دوں''۔
''مبارک باد۔''
''آج بعد مغرب ملاد ہے۔ کھانا کھا کر جاؤ گی۔''
رشیدہ چائے پی کر چلی گئی۔ جھمکے کا ذکر نہیں نکالا۔ باجی کو اطمینان ہوا۔ وہ ملاد میں گئیں لیکن جھمکا نہیں پہنا۔ کیا پتہ مانگ لیتی۔
ایک دن باجی کے چہرے پر نیلی لکیر ابھر آئی۔ اس دن انہیں ایک تقریب میں جانا تھا۔ باجی صبح ہی لاکر سے جھمکا نکال لائیں۔ شام کو کپڑے تبدیل کرنے لگیں تو کان میں جھمکا نہیں تھا۔ ان کی تو جیسے جان نکل گئی۔ سنگار میز کی دراز میں دیکھا، الماری میں تلاش کیا، ہینڈ بیگ میں جھانکا جھمکا کہیں نہیں تھا۔ پھر اچانک یاد آیا کہ صبح غسل خانے میں اتارا تھا۔ غسل خانے کی طرف دوڑیں لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ سریہ نہا رہی تھی۔ باجی نے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔
''جلدی کھول احمق....کھول جلدی....!''
سریہ اس حال میں نہیں تھی کہ دروازہ فوراً کھول دیتی۔ وہ اس وقت جسم میں صابن مل رہی تھی۔
''کھولتی کیوں نہیں ری کل جبھّی....!'' باجی زور زور سے دروازہ پیٹنے لگیں۔
سریہ گھبرا گئی کہ باجی کو اتنی جلدی کیا ہے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صابن لگا برہنہ جسم کس طرح ڈھکے؟
''کھول....کھول ....کھول .....حرامزادی....'' باجی دروازہ لات سے بھی پیٹنے لگیں۔
سریہ نے تولیے سے ہی کسی طرح اپنا آدھا جسم ڈھکا اور دروازہ کھول دیا۔
''اتنی دیر کیوں لگائی کمبخت...؟ میرا جھمکا کہاں ہے؟''
جھمکا آئینے کے شیلف پر پڑا ہوا تھا۔ باجی نے جھپٹ کر اٹھا لیا۔
''دُر باجی....آپ بھی پیتل کے جھمکے پر جان دی ہوئی ہیں۔'' سریہ نے کبھی غصّے کا اظہار کیا تھا تو یہ اس کا پہلا غصّہ تھا۔
''پیتل کا جھمکا....؟ کیا بکتی ہے احمق....؟''
''اور نہیں تو کیا....'' سریہ نے باجی کے ہاتھ سے جھمکا لیا اور اپنی ہتھیلی پر دو تین بار زور سے رگڑا۔
''یہ دیکھئے....یہ پیتل نہیں ہے تو کیا ہے؟ کوئی احمق ہی اس کو سونا کہے گا۔''
سریہ کی ہتھیلی پر اگی ہوئی نیلی لکیر باجی کے رخسار پر ابھر آئی.....!!!

☆☆☆

آجکل کی فائل سے:

منور لکھنوی

گاندھی جی کی شہادت

پست منزل ہے فلک بے نور سورج چاند ہیں — جتنے سیارے تھے ساکت ہیں ستارے ماند ہیں
پھٹ گئے ہیں بادلوں کے دل، ہوائیں سرد ہیں — رنگ ایسا اڑ گیا پھولوں کے چہرے زرد ہیں
گلستاں کے گلستاں پامال آتے ہیں نظر — جن پہ طاری کیف تھا بے حال آتے ہیں نظر
حدت غم سے چٹانیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں — بے زبانوں کی زبانیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں
کشتیاں بحرواں میں چلتے چلتے رک گئیں — گردنیں اشجار کی صحن چمن میں جھک گئیں
شمع کی لو محفل عشرت میں تھرانے لگی — جو کلی کھلنے پہ آمادہ تھی مرجھانے لگی
ظلمتیں امڈیں، امڈ کر آسماں پر چھا گئیں — حسرتیں طوفان بن بن کر قیامت ڈھا گئیں
سسکیوں پہ سسکیاں یزدانیت بھرنے لگی — شیطنت، نیکی کے بندوں کو فنا کرنے لگی
جو فرشتہ تھا، وفور کرب سے چلا اٹھا — اپنے پیارے کی ہلاکت سے خدا گھبرا اٹھا

کس قدر ہے آہ درد انگیز گاندھی جی کی موت
ہے حقیقت میں قیامت خیز گاندھی جی کی موت

موت سے بے باک ہونا موت کا پیغام تھا — جاوداں ہونا تھا جس کو وہ فنا انجام تھا
عین ہنگام دعا دشمن کی زد میں آ گیا — جو فریب ومکر سے تھا دور، دھوکا کھا گیا
ہاتھ ظالم کے بڑھے شفاف سینے کی طرف — موج طوفاں خیز دوڑ اٹھی سفینے کی طرف
کارگر تھا وار، دم لینے کی مہلت بھی نہ دی — پھر خدا کا نام لینے کی اجازت بھی نہ دی
یوں تو کہنے کے لیے قابو میں قاتل آ گیا — جس نے دیکھا منظر دہشت فزا گھبرا گیا
ہاتھ جو بہر دعا اٹھے تھے، اٹھ کر رہ گئے — دیکھ کر عالم یہ آئینے بھی ششدر رہ گئے
نور غائب ہو گیا، تاریک دنیا ہو گئی — وحشت دل اس قدر پھیلی کہ صحرا ہو گئی
ریڈیو کا ساز ماتم کی صدا دینے لگا — غم کی گہرائی کا دنیا کو پتا دینے لگا
مشرق ومغرب میں حسرت کی گھٹائیں چھا گئیں — کس قدر کمزوریاں نوع بشر میں آ گئیں

آدمی کا آدمی ہونا سراپا ظلم ہے
آدمیت یوں فنا ہو جائے کتنا ظلم ہے

'آجکل' گاندھی نمبر، 1948

نثار راہی

منشی مرغوب

کوئی پودا یوں ہی آسانی سے تناور درخت نہیں بن جاتا۔ اس کے درخت بننے میں ایک بڑا وقت لگتا ہے۔ جب تک وہ نرم و نازک رہتا ہے اسے اپنی بقا کے لیے مخالف حالات کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح متوسط طبقے اور کم معاش کے آدمی کے بیٹے سلیم کو مخالف حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے سماج میں اپنی جگہ بنانا پڑی۔ دن میں نوکری کرتے ہوئے پارٹ ٹائم میں تعلیم حاصل کی اور جیسے ہی ایل ایل بی پاس کیا وہ نوکری چھوڑ کر وکیل بن گیا۔ عدالت آیا تو یہاں بھی جدوجہد کا دور شروع ہوا۔ مقدمے آنا اور مقدموں سے معقول آمدنی ہونا آسان نہ تھا۔ یہاں بھی دوسروں سے مقابلہ کر کے اپنی جگہ اور قدم جمانے میں ایک بڑا وقت لگ گیا اور بالآخر وہ وقت آ ہی گیا کہ شہر میں لوگ اسے پہچاننے لگے اور اس کے پاس کام آنے لگا۔

اتنا سب ہونے کے دوران وہ اپنی نجی زندگی بھی سنوارتا رہا۔ والدین سے ہٹ کر الگ گھر بنایا۔ گھر بنایا تو گھر والی بھی درکار تھی۔ کئی لڑکیوں میں سے ایک کا اس نے انتخاب کیا۔ وہ تھی مہ جبیں۔ معقول شکل وصورت اور ذہانت کی مالک۔ لگتا تھا کہ وہ اس کی زندگی مزید سنوارے گی۔ دھیرے دھیرے وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہو رہی تھی۔ لہٰذا گھر کی طرف سے وہ بے فکر ہو گیا۔ عدالت اور گھر دونوں چلتے رہے۔ پھر وہ دو بچوں کا باپ بنا اور زندگی میں یہاں تک کا سفر کرتے کرتے وہ چالیس سال کا ہو گیا۔ جدوجہد کے دن گزر چکے تھے اور اب بے فکری کے دن تھے۔ بچے بڑے ہونے لگے تھے اور پھر اسکول بھی جانے لگے تھے۔ معاشرے میں لوگ اسے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

P-44، بی ڈی اے کالونی، ٹیلہ جمالپور، بھوپال
فون: 09827565602

لیکن عدالت میں دیگر کے مقابلے مزید اونچا اٹھنے کے لیے جدوجہد جاری رہتی ہے۔ اس کے دو اسسٹنٹ وکیل تھے اور مرغوب نام کا ایک منشی۔ عدالتوں کے چھوٹے مقدموں میں دونوں اسسٹنٹ اس کی طرف سے حاضری دیتے اور پیشیاں بڑھوا لیتے۔ گواہوں سے جرح یا مقدمے کے آخر میں بحث خود اس کو ہی کرنا پڑتی تھی۔ ہاں منشی مرغوب اس بات کا دھیان رکھتا تھا کہ کسی بھی مؤکل کو پریشانی نہ ہو۔ نئے مؤکلوں سے وہ اس طرح بات کرتا تھا کہ اگر وہ ان کے آفس میں ایک بار آ جاتے تو پھر واپس نہ جاتے۔ ان سے ادب سے بات کرنا اور عدالت میں دوڑ دوڑ کر ان کے کام کرنا اور خرچ کے معقول پیسے لینا۔ مرغوب نے اپنے بہترین کام سے سلیم کے دل میں جگہ بنائی تھی۔ اس کی اجازت سے مرغوب مؤکلوں سے فیس بھی لے لیتا تھا اور شام کو پورا حساب کر کے سلیم کے پاس جمع کرا دیتا تھا۔ اتنا اچھا اور ایماندار منشی ملنے سے سلیم اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا تھا۔ وہ بے فکر ہو کر دن میں عدالت سے باہر کسی بھی کام کو چلا جاتا۔ پھر تو سارے مؤکلان کو منشی مرغوب ہی سنبھالتا۔

مرغوب بی اے پاس تھا۔ سلیم نے اسے رات کے کالج میں ایل ایل بی میں داخلہ دلا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا وفادار منشی کچھ ترقی بھی کرے۔ اگر وہ قانون کی ڈگری لے کر وکیل بن گیا تو یقیناً اور زیادہ اچھی طرح اس کی مدد کر سکے گا۔

منشی مرغوب کا سلیم کے گھر بھی آنا جانا ہو گیا تھا۔ کبھی سلیم علیل ہوتا یا شہر سے باہر ہوتا تو مؤکلان سے لی ہوئی فیس جمع کرانے یا گھر کا سودا سلف دینے وہ گھر چلا جاتا اور روپیہ یا سامان کی تھیلی وہ پردے کے اندر سے بیگم کے نکلے ہوئے ہاتھ میں دے دیتا۔ سلیم، مسکین سا نظر آنے والا، باادب اور مسکرا کر بات کرنے والا مرغوب ہر طرح بھروسہ کیے جانے لائق تھا۔ خاص مواقع پر اسے گھر میں کھانا بھی کھلا دیا جاتا۔

سلیم کی آمدنی میں خاصا اضافہ ہو گیا تو اس کے طرز زندگی میں تبدیلی آنے لگی۔ اسکوٹر پر شہر میں چلنے والا سلیم اب کار سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ اپنی شامیں یا راتیں اب وہ گھر پر بیوی بچوں کے ساتھ نہیں بلکہ باہر یار دوستوں کے ساتھ گزارتا۔ ان کے ساتھ پارٹیوں میں جاتا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ شراب بھی پی لیتا۔ رات کو اس کا دفتر بند رہتا تھا۔ مرغوب رات میں کالج جاتا تھا اور ایسے میں سلیم کے ساتھ فرصت ہی فرصت تھی۔ اس کا آفس صبح کے وقت کھلتا تھا۔ اب تک زندگی میں جدوجہد بہت کی تھی۔ اب رئیسوں کی طرح وہ عشق کیوں نہ کرے۔ بلکہ اب تو وہ خود ایک رئیس آدمی ہے۔

رات کو گھر دیر سے آنا اور صبح دیر سے اٹھنا۔ پھر صبح کے وقت آفس کبھی جانا کبھی نہ جانا۔ مرغوب تو آفس میں سب کچھ سنبھال ہی لیتا تھا اور مؤکلان سے فیس لے کر وہ یا تو کورٹ میں اسے دے دیتا تھا یا پھر گھر آ کر دے دیتا۔ سلیم کے گھرانے میں منشی مرغوب کی اہمیت بہت ہو گئی تھی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اب سلیم کی زندگی مرغوب کے سہارے ہی چل رہی تھی۔ مہ جبیں کب تک اس سے پردہ کرتی، ایک دن سامنے آ ہی گئی لیکن عموماً وہ اس سے فاصلے پر بیٹھتی۔ عدالت کے کام اور گھر کے کام، مرغوب ہی ان پر بات کرتا اور مشورے دیتا، سلیم گھر میں ہو یا نہ ہو۔

یہ پچھلے دنوں کی بات ہے۔ سلیم کو ممبئی گئے ہوئے چھ دن ہو گئے تھے۔ عدالت میں اس کی ضرورت تھی۔ اسسٹنٹ لوگ ٹھیک طرح کام سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ گواہوں سے اچھی جرح تو تجربہ کار وکیل ہی کر سکتا ہے۔

شام کا وقت تھا۔ مرغوب نے کمرے کے اندر بیٹھی مسز سلیم سے کہا بھابھی صاحبہ، آپ سلیم صاحب کو سمجھایئے، اس طرح اپنے کام سے لاپرواہی برتنے سے ان کی وکالت خراب ہوجائے گی۔ عدالت میں نئے نئے بہت سے وکیل آگئے ہیں، وہ ہمارا کام لے لیں گے۔ مؤکل وہیں جاتا ہے جہاں اس کے کام پر توجہ دی جاتی ہے اور مقدموں میں کامیابی ملتی ہے۔

اندر خاموشی۔ جیسے مرغوب کے اس انکشاف نے بیگم سلیم کو سن کر دیا ہو۔ یا جیسے جواب کے لیے مہ جبیں کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ مرغوب نے جواب لینا ٹھیک بھی نہیں سمجھا۔ صوفے سے اٹھ گیا اور چلتے چلتے بولا ''آپ انہیں سمجھایئے ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے لیکن بگڑ سکتا ہے۔ وقت پر گرفت مضبوط نہیں ہوگی تو وہ ہاتھوں میں سے پھسل جائے گا اور کسی اور کے پاس چلا جائے گا۔ اچھا وقت اپنی غلطیوں سے ہی جاتا ہے۔''

سلیم ایک دوست کے ساتھ ممبئی سے لوٹا تو دو روز تک وہ گھر میں آرام کرتا رہا۔ عدالت کے کاموں کی تفصیلات شام کو گھر آکر منشی جی نے دیں۔ اس نے کہا کہ بعض مؤکلان فیس اسے نہیں دیتے ہیں اور دو دو ماہ کی پیشیاں لے کر چلے جاتے ہیں۔

منشی مرغوب چلا گیا تو مہ جبیں نے اپنے تیور بدل کر میاں سے کہا۔ ''عیش کرنے والا وکیل زیادہ دن نہیں چلتا۔ اچھے وکیل کی وکالت ہمیشہ محنت کرنے سے ہی چلتی ہے۔ عیش پسند ہونے کے ساتھ تم آرام طلب بھی ہوگئے ہو۔ عدالت کا کام دھیرے دھیرے بگڑتا جارہا ہے۔ آمدنی کم ہوتی جارہی ہے۔''

''یہ سب تم سے منشی نے کہا ہوگا۔'' جب وکیل کا شہر میں نام ہوتا ہے تو اس کا کام کبھی نہیں بگڑتا۔ لوگ وکیل کا نام دیکھتے ہیں اور کیس کے رزلٹ پر نظر رکھتے ہیں، درمیان میں کام کیسا ہورہا ہے یہ وہ نہیں جانتے۔ میرا کام بھلا کیوں بگڑے گا، اسے میں ہی تو دیکھتا ہوں، سب کیسوں میں خاص گواہوں کی گواہی تو میں ہی کراتا ہوں.....اور ہاں تم نے ابھی کہا تھا کہ آمدنی کم ہوتی جارہی ہے۔ کہیں فیس کے پیسے منشی تو نہیں مارنے لگا۔ آج کے انسان کا ایمان بگڑتے کیا دیر لگتی ہے۔''

''کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ تمہیں روزانہ آفس میں اور کورٹ میں ہونا چاہئے۔''

بات ختم ہوگئی۔ مہ جبیں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ منشی مرغوب ایسا نہیں ہے کہ اپنے مالک سے بے ایمانی کرے۔ وہ نہایت شریف اور ایماندار آدمی ہے۔

وقت مزید گزرا۔ منشی مرغوب نے ایل ایل بی پاس کرلی اور وہ وکیل ہوگیا۔ اب وہ سلیم کا جونیئر ہوگیا تھا اور تھوڑی بہت مقدموں کی پیروی بھی کرلیتا تھا۔ اسے نہ تو انگریزی آتی تھی اور نہ دماغ ہی اتنا تھا کہ وہ اچھی وکالت کرتا۔ اچھی وکالت تجربہ مانگتی ہے اور وہ نیا ہی تو تھا۔ وکیل کے طور پر وہ ایک اچھی کوشش ضرور کررہا تھا۔ ہاں سلیم کے مقدمے کم ہوگئے تھے لیکن اخراجات کم نہیں ہوئے تھے۔ شراب پیتے ہوئے اسے کئی سال ہوگئے تھے اور مسلسل شراب پینے سے اس کا بلڈ پریشر متواتر ہائی ہوتا جارہا تھا۔ مہنگی شراب اور مرغ وماہی اس کی جیب خاص ڈھیلی کررہے تھے۔ پھر مرغوب بھی اس سے فیس میں سے اپنے حصے کی رقم بٹالیتا تھا۔ بدلتے ہوئے خراب حالات کا اثر سلیم کے دماغ پر پڑرہا تھا اور وہ متفکر رہنے لگا تھا۔ کام ہاتھوں سے چھوٹنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ دوسرے اونچا جارہے ہیں اور وہ نیچے ہی نیچے جارہا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ مؤکلان کبھی وفادار نہیں ہوتے۔ اچھے سے اچھے وکیل کے پاس جاتے ہیں اور وہ اچھا یعنی بہترین کب رہا تھا۔ واقعی اس سے غلطیاں ہوئیں، اس بات کا احساس اسے ہوچلا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ یاری دوستی اور شراب پینا کم کردیا۔ اب وہ بلاناغہ عدالت جانے لگا تھا اور سارے بڑے مقدموں کی پیروی خود ہی کرتا تھا۔ ساتھی وکیل حیرت میں تھے کہ میاں جی راہ راست پر بھلا کیسے آگئے۔ انہیں فکر یہ تھی کہ وہ اس طرح راہ راست پر رہا تو مؤکلان پھر مکھیوں کی طرح اس سے جھومیں گے۔ اس کی شخصیت میں ویسے ہی مقناطیس تھا۔ وکیل کی شخصیت میں مقناطیسی اور ساتھ ہی ذہانت ہو تو لوگ اس کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ اور مرغوب بھی محسوس کررہا تھا کہ اب بہت کچھ نارمل ہوگیا ہے۔ آفس کی آمدنی بڑھے گی تو اس کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا۔

ایک روز رات میں سلیم کو خون کی الٹی ہوئی۔ اسپتال میں ڈاکٹر نے بتایا کہ برین ہیمریج ہوا ہے۔ انجکشن اور دوائیں تو دی گئیں مگر ایک گھنٹے بعد سلیم نے دم توڑ دیا۔ صبح سارے شہر میں اس کی رحلت کی خبر پھیل گئی۔ جوان موت سے لوگ حیرت زدہ ہوئے۔ لیکن سلیم کے گھر میں اس کے بیوی بچوں پر کیا گزری، اس کو بیان کرنا مشکل ہے۔ مہ جبیں صدمے میں ہی نہیں بلکہ ڈپریشن میں آگئی تھی۔ ایسا لگا کہ یکایک مصائب کا پہاڑ گر پڑا۔ زندگی کی ناؤ بیچ منجدھار میں رک گئی تھی۔ گھر تو شوہر کے سہارے ہی چلتا ہے۔ بچے اچھے اسکولوں میں جارہے تھے اور گھر میں کھانا اچھے قسم کا پک رہا تھا۔ گھر میں لوگ فیشن کے اعلیٰ درجے کے کپڑے پہن رہے تھے۔ شہر میں ان کی عزت بھی اچھی تھی۔ بیوی اور بچے رشتے داروں اور ملنے والوں کے گھروں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ معاشرے میں ان کا رتبہ بلند تھا۔ ایسی زندگی جینے میں مزہ آرہا تھا لیکن سلیم کے جاتے ہی وہ سب دھڑام سے گر گیا۔ وہ لوگ تو اب ایک دم سے غریب ہوگئے تھے اور اس دنیا میں غریبوں کو بھلا کون پوچھتا ہے۔ غریب ہونے کے ساتھ وہ بیوہ ہوگئی تھی اور ساتھ ہی بے حد تنہا اور لاچار بھی۔ لیکن بڑا سوال اب یہ اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ اب اس کا گھر چلے گا کیسے اور اس کے بچے اچھے اسکول میں پڑھیں گے کیسے؟

تین روز کے بعد ہی مرغوب پھر سے عدالت جانے لگا۔ اب وہ سلیم کے مقدموں پر زیادہ دھیان دے رہا تھا۔ سلیم کے دونوں اسسٹنٹ بھی کام کررہے تھے مگر ان کا جذبہ سرد پڑنے لگا تھا۔ وہ وہاں سلیم سے سیکھنے کے لیے آئے تھے۔ اب سلیم ہی نہیں تو وہاں رہنے سے فائدہ؟ سلیم سے حاصل ہونے والی جو کچھ بھی آمدنی تھی وہ بھی بند ہوگئی تھی۔ دو ماہ بعد وہ آفس چھوڑ گئے۔ مرغوب کچھ اچھے سینئر وکیلوں سے اہم معاملوں اور پیچیدہ قانونی نکتوں پر صلاح لے لیا کرتا تھا اور اب پہلے سے بہتر مقدموں کی پیروی کرنے لگا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ سارے مؤکلان آفس چھوڑ کر نہیں گئے۔ کافی لوگ باقی رہ گئے تھے اور کچھ نئے بھی آجاتے تھے۔ مؤکلان سے پرانے اور نئے مقدموں سے جو فیس آتی وہ پہلے کی طرح ہی پابندی سے گھر جاکر بچے کے ذریعے رقم کا لفافہ اندر بھیج دیتا اور تب مہ جبیں سوچتی کی دنیا والے اتنے خراب اور بے درد تو نہیں کہ جتنا کہا جاتا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ کمائی کرنے والا دنیا سے چلا جائے تو بہت مصیبت آجاتی ہے اور اس مصیبت میں کوئی ساتھ نہیں دیتا لیکن یہ مرغوب پتہ نہیں کس مٹی کا بنا ہے کہ اس کی وفاداری اور ہمدردی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی وجہ سے گھر والوں کا معیار ابھی قائم ہے۔ لیکن کب تک؟ وہ خود کا گھر چھوڑ کر ہمیشہ تو اس کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ بے شک ابھی وہ ہمدردی کررہا ہے یا پھر اسے اپنے مرحوم باس کے گھر والوں پر ترس آرہا ہے۔

لیکن کسی کی ہمدردی کرنے یا اس پر ترس کھانے کی بھی ایک میعاد ہوتی ہے۔ یہ میعاد ختم ہوگئی تو پھر.....؟ مصیبت تو آ کر رہے گی اور وہ برباد ہوکر رہیں گے۔ سلیم نے کوئی خاص بینک بیلنس نہیں چھوڑا تھا اس لیے پیسے بالکل ہی ختم ہوجانے پر شاید بھوکا رہنے کی نوبت آجائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ گئی۔

سلیم کی زندگی میں تو مرغوب اس کے گھر آنے میں کبھی کبھی دو تین روز کا ناغہ بھی کر دیتا تھا لیکن اب وہ بلا ناغہ روزانہ گھر آرہا تھا۔ دینے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو گھر کے کاموں کے بارے میں پوچھ لیتا اور اسکوٹر سے بازار جا کر سودا بھی لے آتا۔ وہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ گھر کے روٹین میں فرق نہ آئے۔ سلیم صاحب نہ ہوئے تو کیا ہوا۔ ان کا یہ وفادار منشی تو ہے۔ بیگم صاحبہ کو اور بچوں کو بے سہارا کیسے چھوڑ دے۔ آج کا زمانہ تو یہ ہے کہ رشتے دار بھی ایسے پریشان حال لوگوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ بلکہ مصیبت کے مارے ایسے رشتے داروں کی وہ تضحیک بھی کرتے ہیں، خراب نظروں سے بھی دیکھتے ہیں اور کسی کسی وقت منہ بھی موڑ لیتے ہیں۔ اسے بھی دنیا کا خاصا تجربہ تھا۔ بچپن میں اس کی ماں بیوہ ہوگئی تھی تو اس کی ماں نے اور اس کے بہن بھائیوں نے کیا کیا نہ دیکھا اور سہا تھا۔ پیسے کی سخت ضرورت ہونے پر مدد مانگنے پر رشتے داروں نے انہیں خوب ذلیل کیا تھا۔ وہ اس گھر کو اس ذلالت سے بچانا چاہتا تھا۔ پھر مہ جبیں بھابی تو ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھیں۔ انہوں نے دنیا کے مصائب اور معاشی پریشانیاں دیکھے ہی کب تھے۔ خدا نہ کرے کہ اب دیکھیں۔

آنے والے دنوں نے مرحوم سلیم کے بیوی بچوں کو منشی مرغوب علی پر اور بھی زیادہ منحصر بنا دیا۔ مہ جبیں کو اندازہ تو تھا کہ ایک بیوہ کے ساتھ لوگوں کا سلوک کیسا ہوتا ہے، اس لیے اس نے اپنے آپ کو گھر تک ہی محدود رکھا۔ کبھی کبھی وہ کسی شادی میں یا پھر بچوں کے ساتھ سنیما چلی جاتی یا پھر بڑے سامان کی شاپنگ کرنے کسی بڑے بازار کو چلی جاتی۔

بھلے ہوں یا برے، دن کسی طرح گزر رہے تھے۔ کبھی مرحوم شوہر کی یاد میں اور کبھی مصروفیات میں۔ پچھلے اور آج کے دنوں کے مقابلے میں فرق جو نظر آیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے آپ سے لاپرواہ ہوگئی تھی۔ عموماً سر کے بال خشک رہتے تھے اور کپڑے کبھی کبھی میلے ہوجایا کرتے تھے۔ ہاں بچوں کے صاف ستھرے پن میں فرق نہیں آیا تھا۔ ان کا دھیان وہ ضرور رکھتی تھی۔ جب وہ تھک ہار کر بیڈ پر لیٹ جاتی تو بہت دیر تک نیند نہ آتی۔ اس وقت بس سلیم کی ہی یاد آتی۔ سلیم کے ساتھ ہنسی مذاق اور ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ۔ اب نہ وہ سلیم تھا نہ وہ چھیڑ چھاڑ اور نہ گھر کے ماحول میں وہ شگفتگی۔ اور کبھی کبھی کی جانے والی وہ مستی۔ دیکھا جائے تو زندگی میں کچھ لطف ہی نہ رہا تھا اور زندگی میں کچھ لطف نہ ہو تو جینے میں مزہ کیسا۔ پھر بھی.....غنیمت ہے کہ منشی مرغوب کی مہربانیوں کے باعث زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ سوچ کر ہی جسم میں پھریری آجاتی ہے۔ میاں جی نے تو کچھ خاص چھوڑا نہیں۔ جب آمدنی خاصی ہونے لگی تھی تو کھانے پینے اور عیش وعشرت میں اڑا دیا۔ اور پھر چل دیے اوپر۔ بیوی بچوں کو نہ جانے کس کے بھروسے چھوڑ کر۔ زندگی کے ساتھ مذاق کرنے لگو تو پھر اللہ بھی ساتھ نہیں دیتا۔ اگر منشی مرغوب جیسا وفادار آدمی نہ ہوتا تو.....جیسا بھی ہے اور جس حیثیت سے بھی ہے، اب منشی مرغوب ہی اس کی زندگی میں ہے۔ اور سلیم کا تو دور دور تک پتہ نہیں۔ اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ وہ اربوں کھربوں میل اور کسی اور دیس کو جا چکا ہے۔ اب وہ نہ ہمیں دیکھ رہا ہے نہ ہم اسے۔ جیسے کبھی وہ ہماری زندگی میں تھا ہی نہیں۔

شام کو یا رات میں منشی مرغوب علی آتا تو بچے دوڑ کر گھر کا دروازہ کھول دیتے اور اندر آ کر ماں سے کہتے ''منشی جی آ گئے، منشی جی آ گئے۔'' پھر اگر منشی جی کے ہاتھ میں بڑی سی کیڈ بری چاکلیٹ ہوتی یا کوئی کھلونا ہوتا تو وہ اور بھی خوش ہوجاتے۔ ایسے میں مہ جبیں بھی مسکرانے لگتی۔ اس کی یہ خوشی اس خوشی سے زیادہ ہوتی کہ جب سلیم گھر میں بچوں کے لیے کھانے کی کوئی چیز یا مٹھائی لے کر آتے۔ سلیم پر حق تھا، مرغوب پر کوئی حق نہیں۔ وہ خود سے دھیان رکھتا ہے۔ یہ اس کی عظمت ہے۔ بے غرض انسان کی مہربانیوں کا بدلہ چکانا تو ناممکن سا ہے۔

اس نے منشی مرغوب سے پوری طرح پردہ توڑ دیا۔ جب وہ آتا تو دور ایک صوفے پر وہ بیٹھ جاتی اور اس سے پرانے مقدموں اور فیس کے بارے میں اور پھر گھر کی ضروریات کے بارے میں بات چیت ہوتی۔ کبھی کبھی وہ مرغوب کے لیے چائے بنا کر بھی لاتی اور اپنے ہاتھ سے اسے دیتی۔ مہ جبیں کے اتنے قریب آنے پر اور پھر چائے پلانے پر مرغوب کو ایک عجیب سا احساس ہوتا۔ جیسے مہ جبیں نے اس کی عزت بہت بڑھا دی اور اسے زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔ اسے اس پریوار کی خدمت کرنے میں بہت مزہ آنے لگا۔ یہ مرحوم سلیم ایڈوکیٹ کا پریوار تھا جس کا مکھیا اب وہ تھا۔ ایک نچلے درجے کے گھرانے کے فرد پر ایک اعلیٰ خاندان منحصر تھا۔ اس خاندان کا سیاہ وسفید اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ اس کے لیے فخر کی بات تھی۔ دیکھو، مہ جبیں بھابی اب اسے اپنا سمجھنے لگی ہیں۔ اس کے قریب آ کر بیٹھنے لگی ہیں اور اپنے ہاتھ سے اسے چائے پلانے لگی تھی اور کبھی کبھی رات میں کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دیتیں۔ ایسے رشتوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ لیکن یہ رشتے بھی بڑے اہم ہوتے ہیں۔ دل کے بہت قریب ہوتے ہیں۔

اس کے اپنے گھر میں بیوہ ماں اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ وہ پہلے اپنے گھر جاتا، پھر جلد ہی مرحوم سلیم کے گھر چلا جاتا اور کافی وقت ان لوگوں کے ساتھ گزارتا۔ اس گھر سے تعلق رکھنا اسے ایک قدرتی فعل لگتا۔ اور اگر ان بے سہارا لوگوں کو وہ زمانے کے رحم وکرم پر چھوڑ دے گا تو وہ یقیناً ایک غیر قدرتی فعل ہوگا۔ وہ لوگ برباد ہوجائیں گے۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اپنی ماں اور بہن کی طرح یہ لوگ بھی اپنے ہیں، دیکھو، شام کے وقت وہ لوگ کیسی بے صبری سے اس کا انتظار کرتے ہیں اور سب کے سب اسے دیکھ کر خوش ہوجاتے ہیں۔ کیا وہ مرحوم سلیم کی جگہ لے رہا تھا؟ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ سلیم اور مہ جبیں اعلیٰ خاندان سے تھے جب کہ وہ غریب طبقے کا فرد تھا۔ اس کے والد میونسپل کارپوریشن کا ٹرک چلاتے تھے اور معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ خود بھی اگر سلیم صاحب کا منشی نہ ہوگیا ہوتا تو روٹی روزی کے لیے کوئی خراب کام ہی کرتا۔ اسی لیے اعلیٰ درجے کے لوگوں کا ساتھ ملنا اس کے لیے فخر کی بات تھی اور پھر دھیرے دھیرے وہ اعلیٰ درجے کے لوگوں کے گھر کا ہی ایک فرد لگنے لگا تھا۔ اس کی سماجی حیثیت بلند ہو رہی تھی اور یہ اس کے لیے خوشی کی بات تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ اب مہ جبیں اس سے کافی بے تکلف ہوگئی تھی اور اب وہ بغیر آواز دیے گھر میں داخل ہوجاتا تھا اور کچن میں خود ہی اپنے لیے اور مہ جبیں کے لیے چائے بنانے لگتا۔ اور کبھی مہ جبیں کھانا جلد بنا لیتی تو اسے وہیں کھانا پڑتا۔ پہلے کبھی یہ اس کا دوسرا گھر ہوا کرتا تھا لیکن اب یہ اس کا پہلا گھر ہوگیا تھا۔ اور مہ جبیں اب اس کے بہت قریب تھی۔ قریب ہونے کے باوجود دونوں میں ایک فاصلہ تھا۔ حیا کا پاس دونوں نے رکھا تھا۔ ذہن کی آزادی پر بیوگی کے عائد کردہ پہرے لگے ہوئے تھے۔

اور پھر ایک رات.....وہ سب سیکنڈ شو میں سنیما دیکھنے گئے تھے۔ مہ جبیں مرغوب کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ مرغوب کو دور کرنا یا مرد سے دور رہ کر بیٹھنا اسے اچھا نہیں

لگا۔فلم کے دوران مرغوب پاس بیٹھا تو اسے بہت اچھا لگا تھا۔ایک عرصے بعد مرد کا قرب حاصل ہوا تھا۔وہ پاس بیٹھا ہوا تھا تو ذات کے یا طبقے کے درجے کا فرق جاتا رہا۔کسی اپنے اور مہربان کے لیے طبقاتی درجے کا فرق ہوتا ہی نہیں۔ پاس بیٹھے بیٹھے اور پکچر دیکھتے دیکھتے وہ سوچ رہی تھی کہ مرغوب نہ ہوگا تو زندگی پھر کتنی اجاڑ اور ویران ہوجائے گی۔ قدرت نے ایک مرد کو اس کی زندگی سے لیا اور دوسرے کو دے دیا، گھر کو اس کا بڑا سہارا ہے۔

جب پکچر ختم ہوئی تو باہر مہاوٹ کی بارش ہورہی تھی۔موسم سرما میں بارش سے خاصی سردی ہوگئی تھی۔وہ آٹو رکشا میں آئے تھے اور آٹو میں ہی گھر آگئے۔کار تو کب کی فروخت ہوچکی تھی۔گھر آئے تو مرغوب نے اپنے گھر جانے کے لیے کچھ دیر بارش تھمنے کا انتظار کیا۔ڈرائنگ روم میں بہت سردی تھی۔اسے مہ جبیں نے اندر بچوں کے بیڈ پر بٹھادیا۔اور پھر چائے بنا کر لائی تو دھیرے دھیرے دونوں پیتے رہے۔

آج فاصلے کچھ اور بھی دور ہوئے تھے۔مرغوب اب کتنا اچھا لگتا تھا۔اس کی بھولی بھالی شخصیت میں ایک کشش تھی۔لیکن وہ یہاں کچھ دنوں کا مہمان ہے۔کوئی اس کی زندگی میں آجائے گی تو وہ اسے یہاں کیوں آنے دے گی۔ اور وہ یہاں نہیں آئے گا تو پھر کیا ہوگا۔ایک بڑا سہارا نہیں رہے گا۔اس وقت کا تو تصور ہی تکلیف دہ ہے۔

''کیا سوچ رہی ہیں آپ؟'' مرغوب نے پوچھا۔

''یہی کہ باہر بارش ہے اور بے حد سردی ہے۔تم کیسے گھر جاؤ گے۔جو کوٹ تم پہنے ہوئے ہو وہ بھی زیادہ گرم نہیں ہے۔''

''اب سردی ہو یا کچھ ہو، جانا تو پڑے گا ہی، بائک مجھے گھر جلدی پہنچادے گی۔''

''تم چاہو رات یہاں ٹھہر سکتے ہو، اماں کو موبائل پر بتادینا۔تم باہر گئے اور بیمار ہوگئے تو.....؟''

''جوان آدمی ہوں، اتنی سردی سہہ لوں گا۔''

''ایسی سردی کی بارش میں بھیگ جانا خطرناک ہوتا ہے۔''

''اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں۔میرا یہاں ٹھہرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔سماج اس کی اجازت نہیں دیتا۔''

وہ لاجواب ہوگئی! باہر بارش جاری تھی۔بنا رضائی بستر کے یہاں اندر بھی ٹھٹھرن تھی۔مہ جبیں نے رکنے کے لیے اخلاقاً اجازت دے دی تھی تو وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کیا کرے۔اس نے مہ جبیں کو دیکھا۔اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا اور یہ چہرہ کچھ کہہ رہا تھا۔شاید کچھ حدیں پار کرلینے پر تلا ہوا تھا۔اور ہاں، اس کی آواز میں بھی ارتعاش تھا۔ایسا ارتعاش جو اندر کے ٹوٹ جانے کی چغلی کھا رہا تھا۔اگر آج رات وہ یہاں ٹھہر گیا تو یقیناً جو کچھ بھی فاصلے ہیں وہ نہیں رہیں گے۔ اور شاید یہ ممکن نہ ہوگا کہ ایک ہی کمرے میں دو جوان انسان الگ الگ بیڈ پر ساری رات لیٹے رہیں۔ہمارے ذہنوں کی کوئی مانگ نہ بھی ہو تو جسموں کی مانگ ہونے لگتی ہے۔اندھیرے میں وہ بے قابو ہوجاتے ہیں۔اور تب سارے اخلاق اور سارے اصول دھرے رہ جاتے ہیں۔

اور.....ٹھہرو ٹھہرو..... یہ اس کے اندر کیا ہورہا ہے.....اس کا جسم تو ابھی سے بولنے لگا ہے..... چٹک رہا ہے.....اور کچھ مانگنے لگا ہے.....تو پھر.....؟

اس نے آنکھیں بند کیں۔کچھ دیر سوچا۔اور پھر اندر ہی اندر اپنے جسم سے کہا 'نالائق'.....!

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مہ جبیں سے بولا ''میں جارہا ہوں۔مجھے ہر حال میں جانا ہی چاہئے''.....جواب میں وہ کچھ کہتی اس سے قبل ہی وہ گھر سے باہر نکل گیا۔باہر اب بھی بارش ہورہی تھی۔بجلی بھی چمک رہی تھی اور بادل بھی گرج رہے تھے۔!!

☆☆☆

آجکل کی فائل سے

طالب دہلوی

تاثرات

لکھا ہے روز اول سے شہیدوں کے مقدر میں
پیا ہے زہر امرت جان کر اللہ کے پیاروں نے
شہادت سے یہ کس کی اوج پایا ہے شہادت نے
یہ کس کی خاک ہے جس کو مسلماں دفن کرتے ہیں
یہ کس کی یاد سے تازہ ہوئی ہے یاد نانک کی
یہ کس کی محفلوں میں سن رہے تھے اک زمانے سے
یہ کس نے روح مذہب کھینچ کر دنیا میں رکھ دی تھی
پرویا ایشور اللہ کو اک ہار میں کس نے
تشدد کی لڑائی جیت لی کس نے اہنسا سے
دکھایا معجزہ ستیاہ گرہ کا کس نے عالم میں
ہری جن کس کی فرقت میں لہو روتے ہیں آنکھوں سے
یہ کس کی موت سے دونوں ممالک آج غمگیں ہیں
لگا ہے داغ دامن پر یہ کس کے خون ناحق سے
یہ کس نے کردیا رسوا دلیری کو شجاعت کو
مٹھائی بانٹتے ہو کس کی رحلت پر وطن والو
جو ہندو دھرم کا رکھشک سمجھتا ہے تجھے ناتھو
وہ ہندو دھرم کے مفہوم کو اب تک نہیں سمجھا

کبھی سولی، کبھی گولی، کبھی خنجر، کبھی بھالا
بچشم نم زمانے نے یہ منظر بارہا دیکھا
حسین وسرمد و سقراط وعیسیٰ ہوگئے زندا
یہ کس کے پھول ہیں جس کے لیے بیتاب ہے گنگا
یہ کس نے کردیا دیروحرم کو آج پھر یکجا
رحیم ورام کے گانے، کریم وکرشن کا نغما
یہ عاشق کون تھا قرآن کا انجیل وگیتا کا
یہ کس نے چاک کرڈالا دوئی کے وہم کا پردا
پیام گوتم وعیسیٰ کو دل سے کس نے اپنایا
دُھرو ،پرہلاد کی تمثیل جس سے ہوگئی زندا
یہ کس نے مندروں کے دوار ان پر کردیے تھے وا
یہ کس نے ہندو پاکستان کو اس منزل پہ پہنچایا
اُناسی سال کے بوڑھے پہ کس ہندو کا ہاتھ اٹھا
وقار ہند پر کس نے یہ اک تازہ ستم توڑا
دیا کرتے ہیں کیا محسن کو یوں احسان کا بدلا
وہ ہندو دھرم کے مفہوم کو اب تک نہیں سمجھا

یہ کون انسان شکل طائر لبمل تڑپتا ہے
تڑپنے سے یہ کس کے اہل دل کا دل تڑپتا ہے

'آجکل' گاندھی نمبر، 1948

سید آصف اختر نقوی

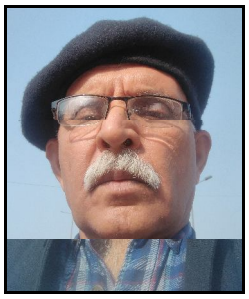

بہروپ

دھلی شہر ہندوستان کی راجدھانی کی ایک معروف شاہراہ ذاکر حسین مارگ پر پرانے قلعہ کی طرف سے آتے ہوئے مشہور پانچ ستارہ ہوٹل اوبرائے کے اگلے چوراہے پر جہاں اب فلائی اوور بن گیا ہے، وہاں بائیں طرف خسرو پارک اور اس کے بعد نظام الدین اولیاء کا مزار اور بستی ہے۔ اس سے ذرا آگے پہلے شمشان گھاٹ اور اس کا چھوٹا مندر، اس کے ساتھ ہی پنج پیران کا قدیم قبرستان مدرسہ اور مسجد اور دونوں کے بیچ لب سڑک انڈین آئل کا پٹرول پمپ۔ میں پچھلے کئی برسوں سے اس سے تھوڑا آگے جنگ پورا میں رہ رہا ہوں اور آتے جاتے اس پٹرول پمپ سے پٹرول ڈلواتا ہوں۔ کل دفتر سے واپسی پر میں نظام الدین بستی سے رومالی روٹی اور سیخ کے کباب لیتا ہوا جب شام کو لوٹ رہا تھا تو میری نظر ڈیش بورڈ پر پٹرول کے میٹر پر پڑ گئی، سوئی آخری نشان پر جھول رہی تھی۔ میں نے اپنی ماروتی 800 (پٹرول پمپ میں بائیں طرف موڑ دی۔ یہ پٹرول پمپ بھی تمام ترقی کر رہے ملکوں کے بڑے شہروں کے پٹرول پمپوں کی طرح نئی مشینوں، اشتہاروں، ہورڈنگوں اور گاہکوں کی سہولتوں سے لیس ہو چکا ہے اور چوبیس گھنٹے چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ جیسے ہی کوئی گاڑی پٹرول پمپ کے احاطے میں داخل ہوئی پٹرول بھرنے والے ایک دم مستعد اور ان کے علاوہ اور کئی نوجوان لڑکے لڑکیاں کمپنی کی رنگ برنگی وردیوں اور ٹوپی سے آراستہ آپ کو اپنی طرف متوجہ کر کے کوئی نیا پروڈکٹ یا سروس کے بارے میں بتانے کے لئے بڑھیں گے اور اس کو آپ کو فروخت کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان نوجوانوں کے علاوہ ایک اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کی قسم آج کل پٹرول پمپ پر نظر آنے لگی ہے وہ ہے کسی قسم کا سروے کرتے یا بڑی بڑی دیسی و دیسی کمپنیوں کے بمپر ڈرا یا انعامی اسکیموں اور دنیا دیکھنے کے لیے سستے ٹورسٹ پیکیجز کے بارے میں آپ کو بتانے والے۔ میں ہمیشہ نو تھینک یو کہہ کر ان کو پیچھے والی گاڑی کی طرف اشارہ کر دیتا ہوں۔ آج بھی یہی سب ہوا۔ میں اپنی باری آنے کا انتظار کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ وردی اور غیر وردی والے نوجوان کون ہیں۔ کتنا پڑھے ہیں، کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسکول کالج سے فارغ ہیں یا تعلیم کے ساتھ یہ سب کر رہے ہیں خاص طور پر وہ نوجوان جو پٹرول پمپ کی وردی نہیں پہنے ہیں۔ میری گاڑی میں پٹرول پڑ چکا تھا لڑکے نے کھڑکی سے رسید اور چابی تھینک یو کے ساتھ لوٹائی۔ میں نے سیٹ بیلٹ درست کی اور چابی لگائی ہی تھی کہ میری نظر اس پر پڑی..... وہ پیچھے سے میری طرف کے شیشے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ سامنے شیشے میں دیکھا وہ مجھے پورا نظر آ رہا تھا۔ اب میں سڑک پر آ چکا تھا اور وہ دوسری گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے آگے سڑک پر توجہ کی اور نکل آیا، گھر پہنچتے پہنچتے میں سب بھول چکا تھا، مگر رات کو جب میں ٹی وی دیکھ کر اور پانی پی کر سونے لیٹا اور آنکھیں بند کیں تو اچانک اس کا ہیولہ گاڑی کے سائڈ کے شیشے میں جیسے میری طرف بڑھ رہا ہو۔ ارے یہ کیا میں پٹرول پمپ کا منظر بھول کیوں نہیں پا رہا ہوں، میں نے آنکھیں کھول دیں اور چھت کے گھومتے پنکھے کے پنکھ ڈھونڈنے لگا۔ پٹرول پمپ کے میرے مشاہدے نے گویا جیسے پچھلے تمام مشاہدوں کے مختلف مناظر کے نقوش اچانک نہ صرف ایک واضح تصویر بن گئے بلکہ جیسے اچانک سب کچھ گویا سمجھ میں آ گیا کہ پٹرول پمپوں اور ہر جگہ چمکتے ترقی کرتے ہندوستان کا اعلان اور اشتہار کرتے رنگین اور روشن ہورڈنگ کتنے مضحکہ خیز ہیں اور جیسے ان سب کے رنگ بکھر کر ایک دوسرے میں ملنے لگے اور پھر موبائل فون کے ٹی وی اشتہار کی طرح فریم سے نکل کر ہوا میں تحلیل ہو کر واپس لوٹنے کے بجائے خلا میں اڑ گئے۔ اسی طرح میرے خیالوں میں شمشان، قبرستان، مسجد، مندر، اوبرائے ہوٹل فلائی اوور، نظام الدین اولیاء کی درگاہ، خسرو غالب کی اور نہ جانے کتنی گمنام قبریں اور ان سب کے درمیان انڈین آئل کمپنی کا پٹرول پمپ اور وہاں وہ ہیولہ، بات ایک دم صاف ہو گئی روز روشن کی طرح عیاں.....

ارے معاف کیجئے گا میں نے آپ کو شاید یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ ہیولہ کیسا اور نظارہ کیا تھا جو میں نے پٹرول پمپ پر دیکھا تھا۔ کچھ خاص نہیں آج کے دور کا ایک عام سا مشاہدہ بڑے شہروں اور آس پاس کی بستیوں میں، بڑی بڑی پارٹیوں میں، میلوں ٹھیلوں میں، پارکوں، تفریح گاہوں میں، مالوں امیوزمنٹ پارکوں، بچوں کے اسکولوں کے باہر کی دکانوں کے بیچ، احتجاجی ریلیوں، سیاسی جلسوں جشن آزادی اور جمہوریت کی سرکاری تقریبوں، مذہبی سیاسی جلسوں، ہر جگہ وہ ہیولہ یا شے نظر آ سکتی ہے۔ جی میں پلاسٹک میں ہوا بھر کر بنائے گئے اصل سے کئی گنا بڑے جانوروں، انسانوں، عمارتوں، افسانوی، مذہبی اور کامک کرداروں کے ہیولوں کی بات کر رہا ہوں۔ آجکل ان سب چیزوں کے علاوہ بھی بہت سی اور چیزیں ہوا بھر کے بنائی جانے لگی ہیں۔ دس فٹ کی کوکا کولا کی بوتل رسی سے بندھی آسمان میں اڑتی اصلی سائز کی موٹر گاڑی، تاج محل، ایفل ٹاور، اسٹیچو آف لبرٹی۔ ہمارے ملک میں تو اب 26 جنوری کی پریڈ میں سلامی منچ کے سامنے گاندھی

B-20، پاکٹ I، کیندریہ وہار، نوئیڈا۔82
فون: 9897727341

جی اور اشوک چکر پر چار شیر کا سرکاری نشان بھی اب ہوا بھر کے ہی بنا کر لگائے جاتے ہیں۔ مگر جو آج میں نے پٹرول پمپ پر دیکھا وہ ان سب سے الگ تھا۔ جی بتاتا ہوں وہ کیا تھا یا پھر یوں کہا جائے کہ کون تھا۔ آپ بھی شاید اس کی صورت سے واقف ہوں ورنہ آپ کے بچے تو ضرور اس کو پہچانتے ہوں گے۔ جی میں بات کر رہا ہوں انگریزی کا مک کیریکٹر مکی نام کے چوہے یعنی مکی ماؤس کی۔ اور اس کے ساتھی ٹوم اور جیری، ڈونل اور گوفی وغیرہ۔ جی آج میں نے پٹرول پمپ پر مکی چوہے کے پلاسٹک کے ہوا بھرے خول میں ایک آدمی دیکھا جو ہر آنے والی گاڑی میں بچے تلاش کر رہا تھا اور ان کو یا ان کے والدین کو بچوں کے جوتوں کے اشتہار کے پرچے تھما رہا تھا۔ جی کیا کہا آپ نے۔ تو پھر کیا ہوا۔ آدمی تو ہمیشہ سے ہی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے سوانگ رچتا اور بہروپ دھرتا رہا ہے، درست میلوں ٹھیلوں میں لڑکے بدن پر سفید پوت کر منہ کالا کر کے اور لمبی دم لنگوٹ میں اڑس کر بچوں کو ڈراتے، بجرنگ بلی کے بھگتوں کا دل بہلاتے اور دکشنا پاتے نظر آنا عام بات تھی تو پھر اگر اب بندر کی جگہ بچوں کا دل بہلانے کے لیے کسی نے مکی چوہے کا روپ دھارن کر لیا تو کیا پریشانی ہے۔ جی مجھے کل سے پریشانی ہے وہ یہ کہ ایک تو یہ کردار ہماری کہانیوں کے نہیں ہیں اور دوسرے یہ کہ جو انسان ان کے اندر تھا وہ خود اس خول سے ناواقف تھا، جس کے اندر وہ تھا۔ اس روپ سے ناآشنا جو اس نے دھارن کر رکھا تھا جب کہ وہ لڑکا جو ہماری اپنی لوک کتھاؤں، داستانوں کے کرداروں کے روپ دھارن کرتا ہے یا سوانگ رچتا ہے وہ جانتا ہے کہ وہ کون ہے اور کیا کر رہا ہے، جب کہ مکی ماؤس بنا آدمی صرف یہ جانتا ہے کہ جن کی توجہ وہ چاہتا ہے وہ اس کے بہروپ کو پہچانتے ہیں اس کے لیے کافی ہے۔ جی یہی مشاہدہ مجھے کل سے بے چین کئے ہوئے ہے کیوں کہ میں نے چوہے کے اوپری پلاسٹک کے خول کے نیچے پھٹے پرانے جوتوں میں اس کے کالے میلے لاغر پیر دیکھے تھے اور پھر جیسے مجھے روشنیوں، چمک دمک اور اشتہاری خولوں، ہیولوں کے اندر اور پیچھے کی تاریکی، خلا اور کھوکھلا پن سب واضح ہو گیا۔ پٹرول بننے کا کیمیائی عمل پٹرول پمپ کا شمشان اور قبرستان کے درمیان ہونا، بھیروں مندر اور نظام الدین درگاہ اور خسرو پارک میں پڑے ہوئے فقیر دیکھئے، چرسی، کوڑھی، اپاہج انسانوں کی بھیڑ اور سڑکوں پر دوڑتی گاڑیاں، مندر مسجد گرودواروں، مزاروں، سمادھیوں، بھنڈاروں میں دان بھکشا، خیرات لنگر کے منتظر انسان اور اس سے زیادہ بھیڑ تیرتھوں، عرسوں، لیلاؤں، اجتماعوں میں لوگوں کے ریلے مجھے اچانک آشنا معلوم ہونے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں اب سب سمجھ رہا ہوں۔ رات کو سوتے سوتے میں پٹرول پمپ کے مشاہدے اور ان سے اٹھے تمام سوالوں کے جواب پا کر مطمئن تھا اور رات کو دس بجے والی خبریں سن کر میں جب سونے لیٹا تو میرے ذہن میں دوسرے ہی سوال تھے۔ جیسے کیا ہندوستان کی کرکٹ ٹیم آسٹریلیا سے او ڈی آئی کی سیریز جیت پائے گی۔ کیا اگلے الیکشن میں کانگریس کی قیادت میں متحدہ محاذ بن پائے گا یا نہیں، کیا گوری لنکیش کے قاتلوں کو سچ مچ سزا ہوگی یا نہیں، کیا کسانوں کی مانگیں پوری کی جائیں گی؟ سنگاپور میں صدر امریکہ اور شمالی کوریا کے تاناشاہ کی ملاقات پر دونوں کو امن کا نوبل انعام دیا جائے گا؟ کیا فلسطین کشمیر کے تنازعہ کبھی حل ہو پائیں گے، کیا عرب ہمیشہ سعودی رہے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔

آج صبح میری آنکھ معمول سے آدھے گھنٹے پہلے یعنی کوئی ساڑھے چار بجے کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کہیں اور سے ابھی لا کر یہاں بستر پر لٹایا گیا ہوں۔ اوہ تو میں خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد آیا۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور ابھی ابھی ٹوٹا خواب یاد کرنے لگا۔ میں ایک لق ودق صحرا میں سامنے جاتی اور افق میں گم ہوتی ریل کی پٹری پر برق رفتاری سے دوڑ رہا ہوں۔ میں نے پیچھے نظر ڈالی میرے پیچھے تمام موجود اور انقاذی حیات حشرات الارض چرند و پرند سب دوڑ رہے ہیں۔ ہماری رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور پھر اچانک صحرا میں ایک پٹرول پمپ نمودار ہوتا ہے اور ہم سب دوڑتے دوڑتے یک لخت مشینوں اور موٹر گاڑیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور پھر میں نے محسوس کیا کہ جیسے ایک لمبا پائپ پٹرول پمپ سے نکل کر فضا میں لہراتا ہوا آیا اور مجھ سے جڑ گیا اور میں اچانک پھولنے اور بڑا ہونے لگا نہیں شاید میں تو قد آدم ہی رہا مگر میرے گرد ایک خول یا صرف ایک ہیولہ بلند سے بلند ترین ہو رہا تھا۔ پہلے وہ مجھ سے مشابہ تھا پھر اس نے اپنی شکل وصورت بدلنی شروع کی۔ کبھی ابولہول، کبھی بھیروں، کبھی ہنومان، کبھی براق، کبھی فینکس، کبھی ٹرائی لوبائیٹ، کبھی ڈائناسورس اور کبھی بندر بن مانس چمپینزی اور پھر دم غائب۔ انسان اور پھر میرے پیر زمین سے اوپر اٹھنے لگے اور میں خلا میں دوڑ رہا تھا۔ اوپر اور اوپر شروع میں میں خوفزدہ تھا، مگر رفتہ رفتہ مجھے بلندی کے پرواز کی رفتار کا لطف آنے لگا کہ اچانک نظر نیچے پڑی تو میں خوف سے لرز اٹھا کیونکہ نیچے میں نے دیکھا کہ زمین پر اب بھی میرا ڈھانچہ دوسرے مختلف اقسام کے ڈھانچوں کے ساتھ صحرا میں افق کی طرف جاتی ریل کی پٹری پر دوڑ رہا ہے۔ پھر اچانک میرا ڈھانچہ کسی شے سے ٹکرایا شاید میں اپنے آگے دوڑنے والے سے ٹکرایا تھا یا ہوسکتا ہے پیچھے دوڑنے والا مجھ سے آکر بھڑ گیا ہو اور اس تصادم سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے کی دیوار پر لگی گھڑی نے صبح کے پانچ بجائے۔ میں بستر سے اٹھا غسل خانے میں جا کر واش بیسن کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے برش پر پیسٹ لگا کر منہ میں رکھا اور نظر اٹھا کر واش بیسن کے اوپر لگے شیشے پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ وہاں میری ہی شکل تھی کسی ٹرائی لوبائیٹ کاکروچ ڈائناسور ابولہول یا مکی ماؤس کی شکل نہیں۔ ☆☆

پبلی کیشنز ڈویژن کی مطبوعات اور رسائل وجرائد حاصل کرنے کے پتے

● پبلی کیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، **نئی دھلی** - 3 (24365610) ● 701، سی ونگ، کیندریہ سدن، بیلا پور، **نوی ممبئی** - 14 (27570686) ● 8 ایسپلینیڈ ایسٹ، **کولکاتا** - 69 (22488030) ● اے ونگ، راجہ جی بھون، بسنت نگر، **چنئی** - 90 (24917673) ● پریس روڈ، نزد گورنمنٹ پریس، **ترواننت پورم-1** (2330650) ● بلاک نمبر 4، فرسٹ فلور، گرو کلپ کمپلیکس ایم جی روڈ، نامپلی، **حیدر آباد-1** (24605383) ● فرسٹ فلور، ایف ونگ، کیندریہ سدن، کورامنگلا، **بنگلور** - 34 (25537244) ● بہار اسٹیٹ کوآپریٹیو بینک بلڈنگ، اشوک راج پتھ، **پٹنہ-4** (2301823) ● ہال نمبر 1، سیکنڈ فلور، کیندریہ بھون، سیکٹر H، علی گنج، **لکھنؤ** - 24 (2325455)

انیس اعظمی

چوراہا

بھیکھو، بھولا، بلو، راجو، منوج، عبدل، رادھے شیام، پارو، جمیلن، چمپا، گڑیا، پھپھو، شبنم بوا۔

بھیکھو: ہم لوگ کون جیون جیتے ہیں؟ تجھ کو پتہ چلا.... پتہ چلے گا بھی نہیں۔ کارن اس کا یہ بھی ہے کہ دنیا بہت بڑی ہے پر تیرے اور میرے حصے میں بہت چھوٹا حصہ آیا ہے۔.....کھوراک چھوٹی، جھگی چھوٹی، لنگی چھوٹی، سپنے چھوٹے، اپنے چھوٹے، ارمان چھوٹے، سامان چھوٹے۔ اِجت چھوٹی۔ پیسہ ندارد.....مگر باہر کی دنیا، جھونپڑ پٹی کے آگے کی دنیا۔ بڑی، بہت بڑی، بہت ہی بڑی؟ کیا سمجھے؟.....میں، تو، راجو، منوج، رادھے سیام، عثمان، عبدل اور بلو۔ یہ لوگ اس بستی میں کاہے کو آئے؟....اپنا گھر دوار، مائی باپ، بھائی بہن، گاؤں دیس، ندی نالا، بیل بھینس، سب چھوڑ کر.....کس واسطے آئے ادھر؟ بول بھولا؟

بھولا: اس سہر میں اب تک کیا ملا ہے اور اس کے بعد آگے کیا ملے گا بھیکھو چاچا؟ ہم اپنا سب کچھ چھوڑ کر ادھر آئے کس واسطے....کمانے کے واسطے۔ چلتے بکھت اتنا بھروسا تھا کہ سہر جائیں گے تو کام ملے گا.....کام ملے گا تو پیسہ ملے گا اور پیسہ ملے گا تو سب کچھ ملے گا۔ لیکن ادھر کیا لگا تیرے ہاتھ اور کیا لگا میرے ہاتھ؟ نہ یہاں جلدی کام ملتا ہے اور نہ پیسہ۔ نہ یہاں ہوا تاجی اور نہ کھانا تاجا۔

بھیکھو: اسی کے ساتھ اس کا ڈر، اس کا ڈر۔ جانے کب کون کیا حکم دے دے۔ کون جھگی کھالی کرا دے، کون کام سے نکال دے، کون دوڈنڈا لگا دے۔ یہاں نہ کوئی اپنا بھائی نہ کوئی دوست۔ جندگی میں کیا ملا؟ پہلے بھائی بچھڑا، دوست بچھڑے، اپنے بچھڑے۔

بلو: گانا گاتے ہوئے! دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا.....

راجو: اے بلو! یہ بے مطلب کی راگنی کیوں چھیڑ رہا ہے بھائی۔ تجھے گانا گانا ہے تو گا، پر میرے کو مت سنا۔ میرے کو بس ہنسی مجاک کا گانا سننا ہے۔ جندگی میں پہلے ہی دکھ کم ہے کیا، جو تو یہ دکھ بھرا گانا گا کر ہمیں اور دکھی کر رہا ہے۔ یہ بچھڑنے وچھڑنے کی بات نہ کیا کر.....سب کچھ تو بچھڑ گیا ہم سے۔ بچا ہی کیا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، گاؤں دیہات، کھیت کھلیان، تیج تہوار، بولی ٹھولی، ہنسی ٹھٹھولی، یار دوست۔ ہر چیج چھوٹ گئی۔ اب بچا کیا ہے جندگی میں۔

منوج: روٹی.....روٹی.....روٹی۔ روٹی بچی ہے ..... ایک چیج ہے جس کے ساتھ ہمارا رشتہ بچا ہے، روٹی کا۔ ہمیں زندہ رہنا ہے اس لیے ہمیں روٹی چاہیے۔ چاہے چوری کر کے، چاہے مجوری کر کے، چاہے بھیک مانگ کے۔ روز کام ملے نہ ملے روٹی تو روز چاہیے، کیوں عبدل؟

عبدل: اے منوجوا، یہ ہر بکھت کا رونا دھونا مجھے بالکل پسند نہیں ہے، تین مہینہ سے ایک ایک سے کہہ رہے ہیں ہمرا بیاہ کرادو.....اس دنیا میں ایک ہی کام اچھا ہے وہ ہے بیاہ۔ جس کا بیاہ ہو جاتا ہے وہ آدمی سوسیٹی میں اجت دار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا بال بچہ ہو جاتا ہے پھر وہ آدمی، آدمی سے باپ ہو جاتا ہے اور جو باپ ہو جاتا ہے اس کی اجت ہوتی ہے۔ اور سسر دنیا والے بھلے اسے ماریں پیٹیں وہ جب چاہے اپنی اولاد کو پیٹ سکتا ہے اسی لئے کہتا ہوں ہمرا بیاہ کرادو۔

منوج: ابے عبدل! چلا چلا کر سب کو اسانت کر رہا ہے، ابے چپ ہو گا کہ نہیں۔

عبدل: چپ! چپ تو ہم ہونا ہی چاہتے ہیں، سرت ایک ہے کی ہمرا بیاہ کرادو۔ کسم یاری کی پھر جو ہم کو کوئی اسانت دیکھے تو بتانا۔

راجو: ابے تجھ سے شادی کرے گا کون۔ آئے دن تو بیمار رہتا ہے۔

عبدل: لیو، اسی بات کی تو بیماری ہے۔ بڑ کا ڈاکٹر بھی کہہ رہا تھا کہ تو سادی کر لے سب دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ یار، تمہیں لوگ تو میرے اپنے ہو، بارہ برس ہو گئے گاؤں گئے مجھے، اگر گاؤں گیا تو پتہ نہیں لوگ مجھ کو پہچانیں گے بھی کہ نہیں۔ ہم گاؤں سے بچھڑ گئے، گاؤں ہم سے بچھڑ گیا۔

بھیکھو: دیکھ بھائی میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ یہ بچھڑنے وچھڑنے کی بات نہ کیا کرو۔ جو میرا بچھڑا ہے اوپر والا ویسا دکھ کسی کو نہ دے۔ دوستوں میری تو پہچان ہی بچھڑ گئی۔ تم اپنے گاؤں جاؤ گے تو کوئی نہ کوئی تمھیں پہچان ہی لے گا۔ میرا تو گاؤں ہی بچھڑ گیا۔

بھولا: لوسن لوانوکھی بات۔ ابے آدمی بچھڑتا ہے۔ کبھی گاؤں بھی بچھڑتا ہے؟ بے پھجول کی بات کر رہے ہو۔

بھیکھو: یارو یہ سرحدیں سرحدیں بنتی ہی کیوں ہیں۔ سرحد پر بسنے والوں کا دکھ تم کیا جانو۔ جب میں پیدا ہوا تو میں سرحد کے اِس پار تھا لیکن جب اس سہر میں کمانے کے لیے آیا تو سرکار نے ہمارے گاؤں کو کھسکا کے سرحد کے اُس پار کر دیا۔

بھولا: مطلب کیا ہے تمھاری بات کا؟

بھیکھو: مطلب یہ کہ ہمارا تو سب کچھ بچھڑ گیا۔ جمین تک بچھڑ گئی۔ اب نہ ہمارا گھر ہے نہ دوار۔ بس ایک بچھڑا ہوا سنسار۔

بلو کا گانا: دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا.....

راجو: ارے یاروں کوئی اسے چپ کراؤ، یہ گا گا کر مجھ سے پنگا لے رہا ہے، کیوں عبدل؟

عبدل: ارے بھیا ہمری سادی کرا دو، سچ کہہ رہا ہوں اس کے بعد کوئی پنگا نہیں لے گا۔

(تبھی ایک عورت ان کے پاس سے گزرتی ہے، رادھے شیام اسے آواز دیتا ہے)

رادھے شیام: عبدل، ارے عبدل۔

عبدل: کیا ہے رادھے؟

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔ 500032
فون: 09891535053

رادھے شیام: وہ دیکھ آ رہی ہے تیرے سپنوں کی رانی کی پھوپھو، اس کی بھتیجی سے بیاہ کرلے۔

عبدل: اس کی بھتیجی دیکھی ہے، کھبسو رت بالکل تیرے جیسی ہے، مجھے جورو چاہیے بالکل گوری چٹی۔

پھپھو: جوتی، تو نے میری یہ جوتی دیکھی ہے، اتنا ماروں گی اتنا ماروں گی کہ تجھے مار مار کر گورا کر کے چھوڑوں گی۔

عبدل: دیکھو جی ہمارے منہ نہ لگیو، ہم لڑکی والوں کی اجت کرتے ہیں۔ نہ جانے کب کہاں سادی طے ہو جائے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم جب چاہو جوتی چپل کی بات کرو۔

پھپھو: دیکھو محلے والوں، سمجھا لو اسے، ورنہ پولیس چوکی میں رپورٹ کردوں گی کہ یہ آتے جاتے مجھے چھیڑتا ہے۔

راجو: لو جی کر لو بات، کہاں ہنسی خوشی کی بات ہو رہی تھی کہاں پولیس آ گئی۔

عبدل: یہ بھی کوئی بات ہوئی، ادھر سادی بیاہ کی بات چل رہی ہے، اُدھر جوتی چپل، تھانے پولیس کی بات ہو رہی ہے، بھائی لوگوں، جسے اچھی بات نہ کرنی ہو وہ یہاں سے جائے۔ کسم کھا کے کہہ رہا ہوں میرا بیاہ لگا دو، سارے محلے کی دعوت کراؤں گا۔

راجو: کسم سے؟

عبدل: کسم جھلے اڑان کی۔

پھپھو: دیکھ بھئی لڑکے، اگر تو سچ مچ ایمانداری سے زبان دیتا ہے کہ تو لڑکی کو ڈھنگ سے رکھے گا تو میں اپنی بھتیجی کی سادی تیرے سنگ کرنے کی بات آگے بڑھانے کے لیے سوچوں گی۔ ۔شادی، شادی ہوتی ہے ہنسی ٹھٹھولی نہیں، پہلے یہ بتا اُسے ڈھنگ سے رکھنے کے لیے تیرے پاس کچھ ہے بھی یا صرف ہوائی باتیں ہی بناتا رہے گا۔

عبدل: کسم سے پھپھو.....اپنی جان کی کسم، تو بیاہ کرادے، میں اُسے اپنی جان سے زیادہ مانوں گا۔

پھپھو: اوئے۔ اپنی جان تو اپنے پاس رکھ، کپڑے، لتے اور روٹی کی بات کر۔ ہیں تیرے پاس بول؟

راجو: ارے پھپھو اس نے تو تین سال میں بہت کچھ بچا کر رکھا تھا، دو مہینے پہلے جھگیوں میں جو آگ لگی سب جل کر راکھ ہو گیا۔

رادھے شیام: دیکھو بھائی لوگوں، یہ آگ اور راکھ کی بات نہیں ہوگی۔ ارے لڑکے کے بیاہ کی بات چل رہی ہے، لڈو مٹھائی کی بات کرو، سادی کی بات کرو، ناچ گانے کی بات کرو۔

بلو: شادی چاہے جب کبھی ہو، گانا تو میں ابھی گا دیتا ہوں۔ گانا۔ دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا.....

راجو: ارے یار سادی کی کھوسی میں بھی یہی گانا اور میت ہو تو بھی یہی گانا۔ کوئی اور گانا نہیں ہے کیا تیرے پاس؟

بلو: ہاں ایک اور ہے۔ سناؤں۔

راجو: ہاں سنا

بلو: تو سن

(اسٹیج کے دوسری سمت چار پانچ عورتیں محو گفتگو ہیں۔ مردوں کی بات چیت ختم ہوتے ہی ایک عورت چہرے پر ہلکی سی شرارت کے ساتھ ایک فلمی گانا گاتی ہے)

گانا: نجر لاگی راجا تورے بنگلے پر
میں جو ہوتی راجا تو ہری دلہنیا
ٹھمک رہتی راجا تورے بنگلے پر

گانا کے آخر میں تینوں عورتیں زور کا قہقہہ بلند کرتی ہیں۔

عورت 1 (حمیلن): کیا بات ہے پارو آج بڑی خوس دکھائی دے رہی ہے۔

پارو: کیوں اگر ہم امیر نہیں ہیں، خوش حال نہیں ہیں تو کیا غریبی میں خوش نہیں رہ سکتے۔

عورت 2 (چمپا): ہاں۔ دل تو ہر بکھت یہی کرتا ہے کہ اچانک کچھ ایسا ہو جائے کہ اس جھگی کی جگہ ایک چھوٹا سا گھر مل جائے.....ان گھسے ہوئے بے رنگ کپڑوں کی جگہ نیا چم چم کرتا سوٹ مل جائے۔ ہاتھ میں پرس ہو، پاؤں میں جوتی ہو، کانوں میں بالی ہو، منہ پہ لالی ہو.....

گڑیا: سپنوں میں اڑنا چھوڑ، اوندھے منہ گرے گی۔

پارو: کیوں؟ سپنوں پر بھی پہرہ بیٹھائے گی۔ اگر کوئی سپنوں سے کھوس ہوتا ہے تو اس کو نہیں ٹوکتے۔

عورت 1 (حمیلن): ٹھیک کہتی ہے پارو۔ نہ ہماری قسمت میں کچھ ہے نہ ہاتھ میں۔ یہ دیکھ میرے ہاتھ کو۔ اس کی لکیروں کو تو دیکھ، کیسی مردہ بے جان ہیں۔ اوپر والے نے ان لکیروں میں کچھ لکھا ہی نہیں۔

پارو: مذہبی لوگ کہتے ہیں محنت مجوری کروگے، دھرم پر قائم رہوگے، تو کسمت کا دروا جا کھلے گا۔

عورت 2 ((چمپا): محنت کر کر کے جان دے دی ہم نے۔ پوری جندگانی نہ ہمارے حصے بچپن آیا نہ جوانی میں کوئی پھول کھلا۔ جیسے ہمارے پیدا ہوتے ہی ایک آندھی چلی۔ آندھی بھی دھول بھری۔ دھول ہی دھول.....نہ کوئی کھسی نہ کوئی پھول.....

پارو: اری او نگوری، ناس پیٹی۔ اتنی بڑی باتیں نہ کیا کر، زمین پر رہ، زمین پر۔

عورت 2 ((چمپا): کون سی بڑی بات کی میں نے۔

پارو: اری میں تجھے نہ ٹوکتی تو تو پوری شاعری کر ڈالتی۔ اپنی اوقات میں رہ۔ تو ساعری کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ تیرا اور میرا جنم دوسرے کے گندے کپڑے اور جوٹھے برتن دھونے کے لئے ہوا ہے۔ دیکھتی نہیں، سماج نے ہمارے ناموں کی پہچان بھی مٹا دی۔ اس جھونپڑ پٹی کی سبھی عورتوں کا ایک ہی نام ہے.....کام والی بائی۔

عورت 1 (حمیلن): (چند لمحے کی خاموشی کے بعد)
واہ۔ کام والی بائی۔ مطلب یہ کہ ہم کام والی بائیاں اگر کام چھوڑ دیں تو ان کلونی والی بائیوں کے سب کام ہی رُک جائیں گے۔ ان کو دن میں تارے نجر آ جائیں گے .....کیوں کیسی رہی؟

پارو: تو بھی آسمان میں اُڑنا چھوڑ دے۔ بھوکی مرے گی اور اپنے بچوں کو بھی مارے گی۔ ہر دوسرے چوتھے دن اپنے گھر والے سے پٹتی ہے تب بھی ہوا باجی سے بعض نہیں آتی۔

عورت 1 (حمیلن): ہاں پارو کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو۔ پرسوں میرے مَرد نے مجھے اتا مارا اتا مارا کہ ادھمرا ہی کر ڈالا تھا۔

عورت 2 (چمپا): اری ہاں پرسوں تو بہت پٹی تھی..... بات کیا ہوئی تھی؟ کیوں مارا تھا اس نے اس بے رحمی سے؟

عورت 1 (حمیلن): (زور سے ہنستی ہے)
جے بات نہ اُسے پتا نہ ہمیں پتا۔ وہ مارتا گیا ہم پٹتے گئے، جتی گالی اس نے بکی اس سے جیادہ ہم نے بکی، حساب برابر۔

پارو: ارے ہاں! ہم عورتوں کی قسمت میں یہی لکھا ہے۔ جب کہ ہمیں ماں ہیں، ہمیں بہن ہیں، ہمیں بیٹی ہیں اور ہمیں گھر والی۔

عورت 1 (حمیلن): اگر وہ گھر میں رکھے تب.....مرد کا کیا ہے۔ میرے پڑوس والی لکشمی تھی نہ، اس کے مرد نے دوسری کر لی۔ بیوڑا نہ کام کرتا ہے نہ دھندا۔ بس جورو بدلتا رہتا ہے۔

پارو: افوہ۔ آج میرا اتنا اچھا من تھا۔ اتنے من سے گا رہی تھی۔ تم سب پتہ نہیں کہاں سے چڑیل بن کر آ گئیں میرے گانے کے بیچ میں۔ مجھے گاتے گاتے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی بڑے سے بنگلے کی مالکن بن گئی ہوں اور میرا مرد میرے پاؤں کے نیچے گلاب بچھاتا جا رہا ہے۔ میں نے بہت اچھے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ میرے بدن پر ہیرے جواہر جڑ گئے ہیں۔ میرے گھنے کالے بال کالی گھٹاؤں کے ساتھ خوشی میں جھوم رہے ہیں۔ میں ایک حسین دنیا میں پری بن گئی ہوں۔

عورت 2 (چمپا): اری او سپنوں کی رانی۔ نیچے اتر آ سپنوں کی دنیا سے۔ بڑی آئی پری بننے والی۔ اری ہم سب کام والی

بائیاں ہیں۔ ہمارے حصے میں جو ٹھے برتن، گندے کپڑے ہیں۔ اگر تو ایسے ہی سپنے دیکھتی رہی تو کسی دن پاگل خانے میں ملے گی۔

عورت 1 (جمیلن): پاگل خانہ! وہ ڈاکٹرنی تھی نہ بڑی والی ڈاکٹرنی جس کے گھر میں کام کرتی تھی۔ مجھے اس کے ڈرائیور نے بتائی تھی ایک بات۔ ڈاکٹرنی کے گھر کے بارے میں۔

پارو : کون سی بات؟

عورت 1 (جمیلن): اس نے مجھے بتائی تھی یہ بات کہ بڑی ڈاکٹرنی کی دو بہنیں پاگل خانے میں ہیں اور اس کے ساس سسر ہیں نہ، وہ بوڑھے لوگوں کے لیے بنائے گئے گھروں میں رہتے ہیں۔

پارو : آں کیا کہا؟ بوڑھے لوگوں کے لیے بنائے گئے گھروں میں؟

عورت 1 (جمیلن): ہاں ری۔ جو لوگ بڑے ہوتے ہیں نہ، بڑے.....جات سے بڑے.....پیسے سے بڑے.....رتبے میں بڑے۔ وہ سب اپنے بوڑھے ماں باپ کو اپنے گھر سے ہٹا کر ان گھروں میں بھیج دیتے ہیں جو سرکار نے ان کے لیے بنا رکھے ہیں۔

پارو : چل جھوٹی، ایسے کون سے گھر ہوتے ہیں؟

عورت 2 (چمپا): ہاں یہ سچ کہہ رہی ہے۔ سرکار تو سرکار ہوتی ہے۔ اسے بڑے بڑے کام کرنے ہوتے ہیں۔ سرکار نہ آوارہ جانوروں کے لیے گھر بناتی ہے، پاگل لوگوں کے لیے گھر بناتی ہے۔ اسی طرح بوڑھے ماں باپ کے لیے گھر بناتی ہے۔۔ تاکہ بوڑھے ماں باپ بڑے لوگوں کے گھر میں نہ کھانسیں نہ ان کے بچوں میں بیماری پھیلائیں۔ انھیں سب کاموں کے لیے تو سرکار ٹیکس لگاتی ہے۔

عورت 1 (جمیلن): یہ چمپا ہے نہ اس کی ہر بات پاگل پن کی ہوتی ہے۔ دیکھو کیا کیا بک رہی ہے۔

پارو : اری ہاں۔ دھیان سے دیکھو تو اس دنیا میں جو آیا وہ پاگل ہی ہو جاتا ہے۔ ہم سب بھئی تو پاگل ہی ہیں جو جی رہے ہیں۔ یہ بھی جینے کی جگہ ہے۔ یہ بھی کوئی جندگی ہے۔ ہمارے حصے میں آیا کیا ہے۔ جو ٹھے برتن، میلے کپڑے، گالی گلوچ، مار پیٹ.....

عورت 2 (چمپا): اس سے اچھا یہی تھا کہ تو گانا گاتی رہتی اور اپنے سپنوں میں جیتی۔ چل پارو تو پھر سے گانا گا۔ چھوڑ یہ پاگل پن کی باتیں۔

پارو : اری میں کوئی مسین ہوں جسے جب چاہا سروع کر دیا، جب چاہا بند کر دیا۔ میں انسان ہوں۔ میں جب سوچتی ہوں کہ میں ایک انسان ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں گانا گاؤں۔ میں جب گانا گاتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں ایک عورت ہوں۔ مجھے پتہ ہے عورت کے دل میں مرد سے کہیں جیادہ ارمان ہوتے ہیں۔ عورت رہتی تو جھونپڑی میں ہے لیکن دل میں ایک بنگلہ جرور بسائے رکھتی ہے۔

عورت 2 (نسیمن): پارو گانا سنانا۔

(پل دو پل کی خاموشی) پھر پارو بآواز بلند گاتی ہے۔

نجر لاگی راجا تورے بنگلے پر.....

عبدل: ہمری سادی پکی نہ؟

(تبھی وہاں شبنم بوا داخل ہوتی ہے)

شبنم بوا: واہ جی واہ خوب رونک میلہ لگ رہا ہے۔

عورت 1 (جمیلن): دوسروں کے جو ٹھے برتن اور میلے کپڑوں سے جب دل بھر جائے اور کچھ سمجھ میں نہ آئے تو عورت کیا کرے۔ گانا گا کر اپنا دل بہلائے۔

عورت 2 (چمپا): ہماری جندگی میں کچھ بھی تو اچھا نہیں ہے۔ سپنے بھی وہی دیکھتے ہیں جن کو اچھی نیند آتی ہے۔

شبنم بوا: میں تمھیں ایک سپنا دکھانا چاہتی ہوں جو سچ بھی ہو سکتا ہے، اگر تم سب چاہو تو۔

عورت 1 (جمیلن): سپنا جو سچ ہو سکتا ہے؟ یہ کیسی انوکھی بات؟

شبنم بوا: پرسوں میں پیچھے والی جھونپڑ پٹی میں گئی تھی، وہاں کی عورتوں نے مل کر سرکار سے کہہ کر اپنی ایک سوسائٹی بنالی ہے۔ پڑھنے لکھنے کی سوسائٹی۔

عورت 2 (چمپا): جھونپڑ پٹی میں پڑھنے لکھنے کی سوسیٹی.....لو کیسی انوکھی بات۔ سن لو بھائی۔

گڑیا: اس سے ہوگا کیا.....بوڑھی گھوڑی لال لگام، اب اس عمر میں ہم کیا پڑھیں گے؟

شبنم بوا: کیوں، ہم کیوں نہیں پڑھیں گی، جب اس جھونپڑ پٹی کی سب عورتیں پڑھ سکیں ہیں تو تم کیوں نہیں پڑھ سکیں ہو۔

گڑیا: اچھا چلو ہم لوگ پڑھ لکھ لئے پر اس سے ہوگا کیا۔

شبنم بوا: فیکٹری میں کام مل سکے گا۔ اپنا کاپریٹو بنا سکو گی۔ اگر .....ہم سب مل کر کچھ اپنا سامان بنائیں، اسے بیچیں تو آج نہیں تو کل ہمارے دن پھر جائیں گے۔

عورت 1 (جمیلن): ہاں! میں نے ایک سے سنی تھی یہ بات ۔بھولا نگر جھونپڑ پٹی میں سب جنانیاں مل کر کام کرتی ہیں، اپنا سامان بناتی ہیں، بجار میں بیچتی ہیں۔

عورت 2 (چمپا): ہمیں کیا بنانا آتا ہے، ہم کوئی فیکٹری ، کارخانہ ہیں۔

شبنم بوا: اپنے ہنر کو پہچانو کمجھو، کام چورو، جو کام تمہیں آتا ہے وہیں ہنر ہے، تم روٹی تو بنا سکتی ہو؟

گڑیا: ہاں ہاں روٹی تو بنا سکتے ہیں۔

شبنم بوا: تم پاپڑ بنا سکتی ہو؟

گڑیا: ہاں ہاں!

شبنم بوا: تم کاج بٹن کر سکتی ہو؟

گڑیا: ہاں ہاں!

شبنم بوا: تو پھر ٹھیک ہے، اب ہم مل کر پڑھیں گے، مل کر روٹی بنائیں گے اور ہوٹلوں اور ڈھابوں پر بیچیں گے، مل کر پاپڑ بنائیں گے اور گھر گھر بیچیں گے۔ اب ہم سب مل کر پڑھیں گے.....ہم سب مل کر آگے بڑھیں گے.....

(پھپھو کی آمد۔ سب کو ہنستا چہکتا دیکھ کر۔)

پھپھو: ارے واہ۔ سب لوگ بڑی جمہ داری سے سر جوڑ کر بیٹھے ہو۔ کیا کسی کا رستہ طے ہو گیا۔

شبنم بوا: ارے نہیں۔ ہم لوگ اپنی کوپریٹو سوسیٹی بنا رہے ہیں۔ سب لوگ مل کر کام کریں گے اور منافع بانٹیں گے۔ یہ سادی کی بات تمھیں کہاں سے سوجھی؟

پھپھو: یہ بھی ایک بڑی جمے داری کی بات ہے۔ انسان جہاں اپنے سارے کام کرتا ہے وہاں سادی بیاہ بھی جروری ہے۔ تم اپنی کوپریٹو سوسائٹی میں ایک میرج بیورو بھی کھول دو۔

گڑیا: کیا کہا میراج بیورا؟

پھپھو: اری جاہلو۔ میرج بیورو مطلب سادی بیاہ پھکس کرنے کی سوسیٹی۔ جہاں لڑکا لڑکی سیانے ہوئے، ہم یہ جمے داری لیں گے کہ ان کی سادی پھکس کر دیں۔ یہ بھی تو سماج کی جمے داری ہے۔ بولو ہے کہ نہیں؟

ساری عورتیں: ہاں ہاں بالکل ہے۔

پھپھو: اسی لیے آج میں بیلا کا رستہ عبدل سے پھکس کرنے کی بات کر کے آ رہی ہوں۔ بولو تم لوگوں کو منجور ہے؟

ساری عورتیں: ارے واہ اس سے اچھی کھس کھبری کیا ہوگی۔ چلو یہ جمے داری بھی پوری کر لی جائے۔

عبدل: تو سادی پکی نہ؟ ہم کریں تیاری؟

شبنم بوا: لیکن پہلی اور بڑی جمے داری ہے پڑھنا اور لکھنا۔

پڑھنا لکھنا سیکھو

او بھوک سے مرنے والوں

آگے بڑھنا سیکھو

او بھوک سے مرنے والوں

(ادھر سے دوں کی ٹولی آ رہی ہے، جس میں معمولی کپڑوں اور پلاسٹک کے پھولوں کا ہار پہنے دولہا آ رہا ہے اور اس کے پیچھے ہنستے گاتے باراتی ہیں۔) ☆☆

ڈاکٹر وسیم بیگم

جیلانی بانو کا ناول ایوان غزل

جیلانی بانو کا شمار ان فکشن نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے آزادی کے بعد افسانے کی دنیا میں اپنا ایک مقام بنایا۔ ان کی پیدائش اتر پردیش کے شہر بدایوں میں 1936 میں ہوئی۔ لیکن ان کے والد اپنے کنبہ کے ساتھ حیدرآباد منتقل ہوگئے اور ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت حیدرآباد کی ادبی فضا میں ہوئی۔ جب مصنفہ نے ادبی دنیا میں قدم رکھا اس وقت تک اردو دنیا میں قدآور افسانہ نگار، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، اوپیندر ناتھ اشک، شوکت صدیقی، انتظار حسین، حیات اللہ انصاری، اپنے قدم جما چکے تھے۔ جیلانی بانو نے ان سب تخلیق نگاروں کی تخلیقات کو ذوق وشوق سے پڑھا لیکن انہوں نے اپنی کہانیوں میں ان میں سے کسی کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اپنا اسلوب اور اپنا راستہ الگ اختیار کیا۔ جس وقت تخلیق نگار نے افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا اس وقت پورے ملک میں ایک انحطاطی دور تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں، کمیونسٹ پارٹی سرمایہ داروں اور زمینداروں کو تباہ کرنے کے در پر تھی۔ تلنگانہ تحریک نے بھی زور پکڑ رکھا تھا۔ معاشی حالات بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ اس وقت نوجوان لڑکیاں بھی بے راہ روی کا شکار تھیں۔ ان کے اپنے ہی خاندان کے افراد ان بچیوں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ انہیں سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات سے متاثر ہوکر مصنفہ نے اپنے افسانوں کی داغ بیل ڈالی۔ ان کی کہانیوں میں ان تمام مسائل کو بہ خوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'روشنی کے مینار' 1954 میں منظر عام پر آیا۔ اس وقت تک ترقی پسند تحریک کا خاتمہ ہو چکا تھا اور جدیدیت کا آغاز۔ لیکن ان کے افسانوں پر ان دونوں تحریکوں کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ ان کی ابتدائی دور کی کہانیاں زیادہ تر علامتی ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے کئی اچھے ناول بھی اردو ادب کو دیئے۔ ان ایک کا مشہور ناول 'ایوانِ غزل' جو پہلی مرتبہ 1912 میں شائع ہوا۔ یہ ناول ان کے پورے فکشن میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

'ایوانِ غزل' میں ناول نگار نے دو تہذیبوں کا تصادم دکھایا ہے۔ ایک وہ تہذیب جو جاگیردارانہ ہے۔ زندگی بھر یہ جاگیردار اپنے عیش وعشرت میں مبتلا رہے ان کو عمر بھر شراب اور شباب سے فرصت نہیں ملی۔ چنانچہ اپنے باپ دادا کی تمام دولت لٹانے کے بعد اب یہ بربادی کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں ابھی کچھ اخلاقی اقدار باقی ہیں۔ لیکن ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے اب یہ جاگیریں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ یہ تہذیب دم توڑ رہی ہے۔ ان کے خاندان میں بزرگوں نے پیڑھی در پیڑھی شاعری کی ہے اور اپنے وقار کو بچانے کے لیے جھوٹے یا سچے عشق میں گرفتار رہے اور اسی کو زندگی سمجھا۔ انہوں نے اپنی اولاد کو تعلیم یافتہ بھی کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ کسی قابل بھی بنی۔ لیکن قرض کا بوجھ اتنا زیادہ ہو چکا تھا کہ اولاد کی کمائی سے وہ قرض اتر نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اولاد نے روپیہ پیسہ کمانے کے لیے غلط راستے اختیار کیے اور اس میں اپنی بھانجی کو استعمال کیا۔ دوسری وہ نوجوان نسل تھی جو کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھی۔ اس نسل کی لڑکیوں نے بھی تعلیم حاصل کی اور اسی کے ساتھ بے جا آزادی اور بے راہ روی کی زندگی اختیار کی۔ جس کی وجہ سے اس کردار کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تیسری جانب وہ کمیونسٹ نوجوان نسل ہے جو جاگیرداروں کی جڑوں کو اکھاڑ پھینک دینا چاہتی ہے اور ان سے ٹکر لینے کے لیے وہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔ بس اس کو ہر قیمت پر اس جاگیردارانہ نظام کو ختم کرنا ہے جس میں سرمایہ دار اپنی دولت کے سامنے غریب انسان کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے۔ زندگی بھر اس کا استحصال کرتے ہیں۔ بڑھاپے میں اس سرمایہ دارانہ طبقے کی زندگی جانور سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔

ایک طبقہ اس ناول میں وہ بھی ہے جو درگاہوں اور آستانوں پر بیٹھ کر معصوم عوام کو لوٹ رہا ہے۔ ان کو تعویذ گنڈے دے کر ان سے دولت بٹور رہا ہے اور ان کی مردانگی اس میں چھپی ہوئی ہے کہ وہ چار چار بیویاں بھی رکھیں اور لاتعداد اولاد بھی پیدا کریں۔ اسکے علاوہ ان لونڈیوں کو بھی اپنی ڈیوڑھیوں میں ڈالے رکھیں جو مجبور اور بے بس ہیں۔ تاکہ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں ان کا جنسی استحصال کریں اور پوری زندگی ان کو تڑپنے کے لئے چھوڑ دیں۔ اس ناول کا پس منظر بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ناول کا پلاٹ شروع سے آخر تک مضبوط اور مستحکم ہے کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ کیونکہ یہ ناول کئی خاندانوں کی کہانیوں کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس لیے کہیں کہیں الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن تخلیق نگار جن تہذیبوں کے نقش ونگار ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہے۔ وہ سسکتی اور دم توڑتی ہوئی تہذیب جو آخر کار مٹ گئی اور اس کا کوئی نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔

پورے ناول میں افراتفری کا ماحول ہے۔ یہ وہی پس منظر ہے جس میں اس دور کا انسان گرفتار تھا۔ آباواجداد کی دولت پر عیش کرنا اس دور کے جاگیرداروں کی زندگی کا مقصد تھا۔

کہانی کا مرکزی کردار غزل ہے دوسرے اہم کردار واحد حسین (غزل اور چاند کے نانا) چاند، گوہر بیگم، راشد، سنجیوا، نصیر، بھان صاحب، بلگرامی، ہمایوں وغیرہ ہیں۔ اس ناول میں جیلانی بانو نے اس سسکتی اور زوال پذیر تہذیب کو نشانہ بنایا ہے جو کسی زمانے میں اپنے پورے جاہ جلال کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ چاند جو واحد حسین کی نواسی ہے نہایت حسین اور سلیقے مند ہوتی ہے۔ میڈیکل کی پڑھائی کے ساتھ اس کو میوزک اور ڈراموں کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اس کی ماں چھوٹی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ باپ دوسری شادی کر لیتا ہے۔ اور چاند اپنا گھر چھوڑ کر نانا یعنی واحد حسین کے گھر میں رہنے لگتی ہے۔ نانا کا گھر ایوانِ غزل کہلاتا ہے۔ چاند مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں ماموں راشد اور ممانی اس کا بہت خیال رکھتے

شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، پچی باؤلی، حیدرآباد۔ 500032
فون: 9935980119 waseembegum2011@gmail.com

ہیں۔اس کی اچھی طرح سے پرورش کرتے ہیں۔اس کے نازنخرے اٹھاتے ہیں۔اس طرح بیجا لاڈ پیار میں چاند ایک ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی بن کر بڑی ہونے لگتی ہے۔کیونکہ اس کے والد کے گھر کا ماحول بہت آزاد تھا۔ ہر فیشن کرنا ان کے یہاں ضروری سمجھا جاتا، کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں تھی گھر کی بیٹی کو ہر جگہ آنے جانے کی پوری آزادی تھی۔اس طرح چاند ایک بے باک اور ضدی لڑکی بن کر بڑی ہوئی۔حسن تو خدا نے دیا ہی تھا۔کلا منڈل جیسے مقامات پر اس کو ڈرامے کرنے کا موقع فراہم ہوا۔بڑے بڑے لوگ اس کے آگے پیچھے ہوتے۔اب اس کے لیے گھر کی بندش کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔اسی دوران اس کی ملاقات بھان صاحب سے ہوئی۔ بھان بہت اثر ورسوخ رکھنے والا انسان تھا۔راشد انجینئر ہونے کے باوجود کچھ ایسا بزنس چاہتا تھا جس سے اس کے والد کا قرض اتر سکے۔چنانچہ اس نے چاند کو سیڑھی بنا کر بھان سے خوب فائدے اٹھائے۔جب بھان چاند کو اچھی طرح لوٹ کھسوٹ چکا تو اس نے چاند کو کنارے کر دیا۔اسی دوران چاند کو ایک آرٹسٹ سنجیوا سے پیار ہوگیا۔جو اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے لڑاتا تھا۔جب چاند اس کے قریب آگئی تو وہ اس سے بہت دور چلا گیا۔کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا کارکن تھا اور اس کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں تھا کہ وہ چاند کو دو وقت کی روٹی بھی دے سکے۔ چنانچہ چاند اس کے غم میں گھل کر ختم ہوگئی۔اس کی ساری جوانی اور سارا حسن ماند پڑ گیا۔اب وہ اپنے ماموں راشد کی بھی کسی کام کی نہ تھی۔ ہر وقت سنجیوا کی محبت میں روتی رہتی اور آخر ایک دن وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ایوانِ غزل سے اس کی ڈولی نہیں اس کا جنازہ اٹھا۔ یہاں جیلانی بانو نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جو لڑکی اپنی اخلاقی اقدار کو کچل کر ماڈرن سوسائٹی میں قدم رکھتی ہے وہاں اس کی عزت تار تار ہو جاتی ہے۔ان مقامات پر اس کے جسم کو چاہنے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن اس کو سچے دل سے اپنا بنانے والا کوئی نہیں ملتا۔

واحد حسین کی دوسری بیٹی کی بچی غزل ہوتی ہے۔غزل کا والد ایک سجادہ نشین باپ کا بیٹا ہوتا ہے اور ہمیشہ بیوی کی دولت پر جیتا ہے۔اپنا کوئی کام نہیں کرتا لیکن جب اس کے والد کا انتقال ہو جاتا ہے تو دوسرے سوتیلے بھائی حویلی پر قبضہ کر لیتے ہیں اور اس کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔غزل کا باپ اپنی بربادی کا ذمہ دار اپنی بیٹی کو مانتا ہے، ہر وقت اس کو مارتا پیٹتا ہے۔اپنی بیوی کو بھی مار پیٹ کر اس کے مائیکے بھیج دیتا ہے اور مستقل روپے پیسے کی مانگ کرتا رہتا ہے اور وہ اپنی بیوی کو اپنی بربادی کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔وہ بیچاری روتے روتے اپنے گھر جاتی ہے اور والدین بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر کچھ نہ کچھ اس کی مدد کر دیتے ہیں۔غزل کا باپ ایک عیسائی عورت کو بھی اپنے گھر میں رکھ لیتا ہے۔ان سب تکلیفوں کو غزل کی ماں برداشت نہیں کر پاتی اور آخر کار مر جاتی ہے۔اب غزل کا باپ (ہمایوں) چاہتا ہے کہ تینوں بچوں کو نانا نانی اپنے ساتھ لے جائیں اور ان کی پرورش کریں۔لیکن وہ صرف غزل کو لے جانا چاہتے ہیں کیونکہ غزل بہت چھوٹی ہوتی ہے لیکن غزل کو بھیجنے کے لیے اس کا باپ تیار نہیں ہوتا ہے۔غزل ہر وقت اپنے باپ سے ڈری سہمی رہتی ہے کیونکہ باپ اس کو ہر وقت قہر کی نظر سے دیکھتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر مارتا پیٹتا ہے۔اس پر اتنا ظلم وتشدد کرتا ہے کہ کوئی غیر بھی اتنی چھوٹی بچی پر یہ ظلم دیکھ کر شرما جائے۔

''بتول (غزل کی ماں) کے مرنے کے بعد غزل کی چیخوں پر کوئی بھی کان نہیں دھرتا تھا۔ ہمایوں نے تو خیر اسی دن اس کے وجود پر لعنت بھیج دی تھی جس دن وہ پیدا ہوئی۔مگر ایاز اور شہزاد (بھائی) کو بھی اس سے جنم جنم کا بیر تھا۔اس لیے ہر طرف کی دھتکار کے بعد اسے صرف اماں کے سوکھے سینے سے لگ کر سکون ملتا تھا۔ہمایوں کو تو غزل کو پیٹنے کے سوا اور کوئی دوسرا کام نہ تھا۔''

(ایوانِ غزل، جیلانی بانو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2012 بار دوم ص:155)

اب غزل تنہا رہ گئی تھی اس سے ہمدردی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔جب باپ کی مار کھاتی تو اتنا روتی کہ اس کا نانا کے گھر چیخ دیا جاتا۔اس کے پاس پہننے کے لیے کپڑے بھی نہیں ہوتے۔ چنانچہ ماموں کی بیٹی فوزیہ جو تقریباً اسی کی ہم عمر تھی اس کی اُترن اس کو پہننی پڑتی اور وہ خود چاند سے بہت مرعوب رہتی تھی۔چاند جیسا بننا چاہتی تھی۔چنانچہ اسی لیے اب اس نے شرارتیں چھوڑ کر مستقل اسکول بھی جانا شروع کر دیا تھا۔اب وہ آہستہ آہستہ بڑی ہونے لگی تھی۔چاند نے ایک ڈرامے میں اس کو ایک چھوٹا رول دلوا دیا تھا۔خاموش بیٹھے رہنے کا رول۔وہ غزل نے بہت اچھی طرح نبھایا۔وہاں پر لوگوں کو خود غزل اور اس کی اداکاری پسند آئی۔غزل ذہنی طور پر چاند سے بہت قریب تھی۔جب چاند کی حالت غیر ہو رہی تھی تو اس نے ایک خط بھان صاحب کو لکھ کر بھیجا کہ کسی طرح سنجیوا کو جیل سے رہا کرالیں اور غزل یہ خط لے کے بھان کے پاس گئی۔خود غزل اب جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔اور حسین ہونے کے ساتھ پرکشش بھی تھی۔بھان اس کو دیکھتے ہی لٹو ہو گئے اور انہوں اس کو کلا منڈل کے ڈراموں میں اداکاری کرنے کے مواقع فراہم کئے۔ حالاں کہ بیچاری غزل تو ان کو انکل سمجھتی تھی۔بھان انکل کہتی تھی۔لیکن اس معصوم کو کیا معلوم تھا کہ یہ بوڑھا بھان بھی اس کی جوانی پر فریفتہ ہے۔اس کے حسن کا پجاری ہے۔جب ڈراموں میں اس نے کام کیا تو وہ بہت مقبول ہوگئی۔اور اب اس کے باپ ہمایوں کو علم ہوا کہ اس کی بیٹی میں ایک بڑی اداکارہ بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔تو وہ دوبارہ بیٹی پر مہربان ہو گیا اور اس نے غزل کو مجبور کیا کہ وہ ڈراموں میں ہی کام نہ کرے بلکہ ممبئی جا کر فلموں میں بھی کام کرے۔اگر غزل اس کا حکم ماننے سے انکار کرتی تو اس کا قہر غزل پر ٹوٹتا۔وہ لاتوں اور گھوسوں سے اس کو مارتا۔اسی درمیان اس کی ملاقات بلگرامی سے ہوئی۔اس نے بھی اس کو سبز باغ دکھائے اور کہا کہ بھان تو اس کو استعمال کر رہا ہے۔جیسے اس نے چاند کو استعمال کر کے چھوڑ دیا۔وہ بلگرامی سے محبت کرنے لگی۔بلگرامی نے اس سے خوب محبت کی پینگیں بڑھائیں اور جب غزل نے اپنا سب کچھ اس کو سونپ دیا اور شادی کرنے کے لیے کہا تو بلگرامی شادی کے نام پر رفو چکر ہو گیا۔

''آج بہت دنوں بعد پہلی بار چاند آپا نے اس سے باتیں کیں۔بھارت کلا منڈل کا حال پوچھتی رہیں۔.....غزل نے ان سے کچھ نہیں چھپایا۔بھان صاحب کی دست درازیوں سے لے بلگرامی کی بے وفائی تک۔بے حد غصے میں کہا.....''ہوں.....'' چاند آپا نے کسی گہری سوچ میں ڈوب کر کہا یہ اچھا ہوا کہ تم نے بلگرامی کے حوالے اپنا بدن ہی کیا تھا، اور کچھ نہ دیا۔غزل کی سمجھ میں خاک نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔'' (ص:244)

بھان نے کمسن غزل پر اتنے احسانات اور التفات کیے کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اگر بھان نہ ہوتے تو اب تک اس کی شخصیت مٹی میں مل چکی ہوتی۔

''بھان سے اچھا کون آدمی ہے؟ ہمیں بتاؤ.....تم خود ہی جھگڑا لو تھیں۔ہر ایک سے لڑ جھگڑ کر آگئیں۔اب میں کیا کروں.....؟ کہاں جاؤں؟ اگر بھان ماما نہ ہوتے تو اب تک ابا اس کا قیمہ بنا کر چیل کوؤں کو کھلا چکے ہوتے''۔(ص:233)

اور جب بھان کا کردار راشد ماموں، ممانی رضیہ، نانا واحد حسین کے سامنے آیا تو سب نے ہمایوں کو یہی مشورہ دیا کہ غزل کو بھان کے پاس نہیں جانے دو۔کیوں کہ وہ ایک اچھا انسان نہیں ہے۔

''ہمایوں کہتا تھا کہ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ غزل ہمیشہ فوزیہ کی اترن پہنے فقیر کی طرح ان کی جھوٹن کھانے کو وہاں پڑی رہے۔یہ باتیں غزل کو بھی سچ لگتی تھیں.....اب جب غزل اتنی محنت کے بعد اعلیٰ سوسائٹی میں پہنچ گئی ہے تو سب کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔'' (ص:223)

اسی درمیان غزل کی ملاقات حامد نام کے ایک شریف انسان سے ہوئی۔وہ بھی غریب خانوادے سے تعلق رکھتا تھا۔تو اس نے اس کے ساتھ محبت کی پینگیں نہیں بڑھائیں۔کیونکہ اس

نے پیدائش سے لے کے جوانی تک صرف غریبی اور پیٹ کی آگ دیکھی تھی اور اب وہ دوبارہ اس دلدل میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔ حامد نے اس کے لئے پیغام بھیجا لیکن اس نے منع کر دیا۔ پھر فوزیہ کی شادی کے موقع پر واحد حسین کا بھتیجا نصیر یہاں آیا۔ کیونکہ وہ بہت دولتمند تھا اس کے ماں باپ بڑے جاگیردار تھے اور زندگی میں اس نے عیاشی کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔ یہاں آ کر غزل پر لٹو ہو گیا اور غزل سے شادی کا وعدہ کیا۔ اس کو ایک انگوٹھی بھی پہنائی جو ان کے خاندان میں بہو کو پہنائی جاتی ہے۔ نصیر اور غزل دونوں ایک جان ہو گئے اور پھر شادی کا وعدہ کر کے وہ چلا گیا۔ اور پھر کبھی واپس نہیں لوٹا۔ دوسری طرف جاگیردارانہ نظام کے ختم ہونے اور موت کے خوف سے نصیر کا پورا خاندان پاکستان چلا گیا۔ وہاں پر بھی ان کو تمام جائیدادیں مل گئیں۔ یہاں غزل نصیر کی زندگی کے لیے دعائیں مانگتی رہی۔ اب وہ صرف روتی رہتی۔ گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ گوہر بیگم کے رشتے کے بھائی جو غزل سے چالیس سال بڑے تھے ان کے ساتھ غزل کا نکاح کر دیا جائے۔ کیونکہ اب اس بدنام لڑکی سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ لیکن شاہین نے جو ارشد کا اکلوتا ڈاکٹر بیٹا تھا اس فیصلے کی مخالفت کی۔ گھر والوں سے اس کی بہت بحث ہوئی اور اس نے اپنے والدین کو مجبور کر دیا کہ وہ غزل سے ہی شادی کرے گا۔ غزل اس سے شادی کرنے کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھی۔ کیونکہ وہ نصیر کو ابھی تک اپنے دل سے نہیں نکال سکی تھی۔ اور اس کو لگتا تھا کہ شاہین اس پر رحم کھا کر اس سے شادی کر رہا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ شادی ہوئی۔ دونوں والدین راشد اور رضیہ نے اس سے تمام رشتے توڑ لیے اور ایوانِ غزل میں یہ لوگ اوپر کی منزل میں رہنے لگے۔ واحد اور ان کی بیگم کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ لوگ اپنی بنائی ہوئی بیٹی جو سنجیوا کی اولاد تھی اس کے ساتھ رہنے لگے۔ لیکن شاہین اور غزل ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے۔ کیونکہ نہ شاہین کو غزل سے محبت ہو سکی اور نہ غزل کو شاہین سے۔ شاہین اپنی ڈاکٹری کے پیشے میں بہت مصروف رہنے لگا۔ آخر ایک دن نصیر اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ان کے گھر آیا اور غزل سے بھابھی کی طرح ملا۔ اس نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ غزل اور اس کے بیچ کیا ہے۔ جب غزل اور نصیر کی بیوی کی ملاقات ہوئی تو نصیر کی بیوی نے اسے بتایا کہ نصیر اس سے جنونی حد تک محبت کرتا ہے اور وہ جو اتنا مشہور شاعر بنا وہ صرف اسی لیے بنا کہ وہ مجھے دیکھ کر غزلیں لکھتا ہے۔ اس کا اثر غزل پر بہت بُرا پڑا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور ایک بار نصیر سے اس کی ملاقات ہوئی اکیلے میں تو نصیر نے کہا وہ تو غزل کی یادوں کے سہارے اپنی زندگی گزار رہا ہے اور وہ انگوٹھی جو اس نے پہن رکھی ہے اسے واپس کر دے کیونکہ اس کی ماں کہتی ہے کہ یہ انگوٹھی گھر کی بہو کو پہننی چاہئے۔

''غزل ..... یہ انگوٹھی مجھے دے دو ..... اماں جان کہتی تھیں کہ یہ انگوٹھی نفیس (بیوی) کو پہننا چاہئے ..... ایک دن ہم پر بھی کچھ عنایت کر دو ..... مگر اس طرح کی شاہین کو خبر نہ ہونے پائے ..... قسم خدا کی تمہاری یاد تو میری جان کا روگ بن گئی ہے ..... میں نے تمہارے تصور میں نہ جانے کتنی غزلیں ..... اور نصیر نے آہستہ سے انگوٹھی اتار لی ..... تم آج بھی میری شاعری کی جان ہو ..... لیکن میں چاہتا ہوں کہ دنیا کو ہماری اس دیوانگی کا کوئی ثبوت نہ ملنے پائے ..... وہ نہ جانے غزل کو کب تک پیار کرتا رہا اور کب باہر چلا گیا .....'' (ص:281-279)

آخر کار غزل بھی مر گئی۔ ان محبت کرنے والیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ جن سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں وہ ان کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ زندگی بھر ان معصوم لڑکیوں کو دھوکے اور فریب میں رکھتے ہیں اور جو ملتے ہیں ان سے وہ الفت نہیں کر پاتیں۔ یہی تو غزل کے ساتھ ہوا۔ جاتے جاتے نصیر کی نظر کرانتی پر تھی وہ اس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا کہ جاتے جاتے اس پر بھی ہاتھ صاف کر جائے۔ لیکن کرانتی نے اس کا موقع نہیں دیا۔ کیونکہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح کمیونسٹ گروپ میں شامل ہو کر انہیں کے لیے کام کر رہی تھی اور اس نے نصیر کے ہوس بھرے سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

''لیکن آج ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے ..... ایسی بھی کیا بے رخی .....؟ اس نے کرانتی کا ہاتھ پکڑ لیا ..... کیونکہ نصیر جانتا تھا کہ آج کی لڑکیاں عشق کا یہی انداز پسند کرتی ہیں ..... بے باکی ..... جلد بازی ..... اور ..... زبردستی ..... لیکن آپ کو مجھ سے بہت دور بیٹھنا پڑے گا نصیر صاحب ..... کیونکہ میری جیب میں ٹائم بم ہے ..... کہیں ایسا نہ ہو میں آپ کے پاس آؤں اور آپ مع ایوانِ غزل کے حروف مکرر کی طرح مٹ جائیں .....'' (ص:382)

اس ناول میں جیلانی بانو نے حیدرآباد کی مٹتی ہوئی تہذیب پر کاری ضرب لگائی ہے اور اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ تہذیب عملی طور پر کتنی بچھڑی ہوئی ہے۔ جاگیروں پر عیش و عشرت کرنا ان کی زندگی کا پہلا مقصد تھا۔ ان کے بڑے بڑے محلوں جیسے گھروں میں اپنی بیویاں اور بچے ہونے کے باوجود ایک ڈیوڑھی اسی کام کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ جہاں غریب اور بے سہارا بچیاں رہتی تھیں۔ یہ جاگیردار جب چاہتے، جس طرح چاہتے ان کا استعمال کرتے کیونکہ بچیاں اتنی غریب ہوتی تھیں کہ ان کے پاس کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے یہاں رہ کر خاموشی کے ساتھ اپنے آقا کی ہر بات ماننا ان کا فرض اولین تھا۔ ورنہ پھر ان کو باہر کا راستہ دکھا دیا جاتا۔ اور یہ مجبور لڑکیاں کیا کریں، کہاں جائیں ان ڈیوڑھیوں کے سوا ان بے بس لڑکیوں کا کوئی دوسرا سہارا نہیں تھا۔

اسی ناول میں انہوں نے بدلتی ہوئی تہذیب چاند اور راشد کے روپ میں دکھائی ہے۔ چاند میڈیکل لائن میں آنے کے باجود ڈانس، گانے اور وائلن کا شوق رکھتی تھی۔ ہائی سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا اس کا شوق تھا۔ اور اسی شوق نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔ جانے کتنے مردوں کے ہاتھوں وہ لوٹی گئی اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ راشد انجینئر ہونے کے باوجود لالچی تھا۔ دولت کمانے کے لیے اس نے اپنی بھانجی چاند کا استعمال کیا تاکہ اس کو بڑے بڑے کانٹریکٹ حاصل ہو سکیں۔ دوسری طرف غزل تھی وہ صرف اپنی غربت کی وجہ سے ان غلط راہوں کا شکار ہوئی اور وہ اتنی معصوم تھی کہ مردوں کی چالوں کو سمجھ ہی نہیں سکی۔ ہر مرد نے اس کا جنسی استحصال کیا۔ اور وہ اس کو پیار سمجھ بیٹھی۔ ناول میں شروع سے آخر تک غزل کو ہر مرد نے لوٹا، کھسوٹا اور بے جان شئے کی طرح پھینک دیا۔ شاہین جس کے دل میں کم از کم انسانیت موجود تھی حالانکہ وہ ایک ڈاکٹر تھا، اس کی اچھی سے اچھی جگہ شادی ہو سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے غزل جیسی استعمال شدہ لڑکی کو اپنی بیوی بنایا۔ اپنے گھر میں جگہ دی۔ لیکن غزل ہمیشہ اپنے شوہر سے خوف زدہ رہی کہ کہیں اس کا راز فاش نہ ہو جائے۔ دوسرے وہ نصیر کو دل دے چکی تھی۔ اس کے دل میں دوسرے انسان کے لیے محبت کا جذبہ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ شاہین کو وہ سب کچھ نہ دے سکی جس کا وہ حقدار تھا۔ اس نے مردوں سے اتنے دھوکے اور فریب کھائے تھے کہ وہ سمجھتی تھی کہ شاہین بھی اس کو دھوکا دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ کھیل کر رہا ہے اور آخر میں اس نے بھی موت کو گلے لگا لیا۔

اس ناول کا کینوس بہت پھیلا ہوا ہے۔ مصنفہ نے دم توڑتی ہوئی تہذیب پر جس طرح چوٹ کی ہے وہ قابل داد ہے۔ اس کے علاوہ نکسل واد جس طرح پھیل رہا ہے اس طرف بھی معنیٰ خیز اشارے کئے ہیں۔ تلنگانہ تحریک، کمیونزم اور بڑے خاندان کی لڑکیوں کی بے راہ روی پر بھی خاص توجہ دی ہے۔

اس ناول میں کردار نگاری، جزئیات نگاری، کہانی پن، مکالمہ نگاری، زبان و بیان سب دلچسپ اور متاثر کن ہے۔ کہیں کہیں حیدرآباد کی مقامی زبان کو بھی خوش اسلوبی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

''راشد میاں کیا بول رہے کِتے وڈرنیاں کیا کر رہی ہیں؟'' حکومت کر رہی ہیں پھوپھو ..... قلم ہاتھ میں لے کر کتابیں لکھ رہی ہیں ..... وڈرنیاں نہ ہوئیں اجاڑ صورت بیگماں ہو گئیں۔'' (ص:168)

بحیثیت مجموعی جیلانی بانو کا یہ ناول ایک شاہکار ناول کہا جا سکتا ہے۔ ☆☆

تبصرے

- ☆ تبصرے کیلئے کتاب کی دو کاپیاں لازماً ارسال کریں۔
- ☆ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔
- ☆ تبصرے کے لیے ارسال کی جارہی کتاب کے سرورق کی تصویر ای میل سے بھیجیں۔
- ☆ تبصرے کے لیے تقاضا کر کے شرمندہ نہ کریں۔
- ☆ کتاب کسی بھی صورت میں واپس نہیں کی جائے گی۔

نام کتاب :عوامی مرثیے کی روایت

مصنف : لئیق رضوی

ضخامت :183 صفحات

قیمت :250 روپے

ناشر : قلمکار، الہ آباد

مبصر :علی احمد فاطمی

فون :09415306239

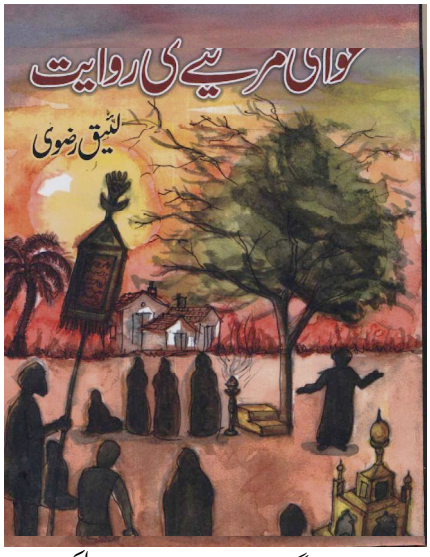

وہ عوامی گیت یا شاعری ہوتے ہیں لیکن عوامی مرثیہ اس سے بھی آگے کی شے ہے جہاں غم مشترک ہوتا ہے، رشتے مشترک ہوتے ہیں۔ ایثار وقربانی مشترک ہوتی ہے۔اس لئے کہاجاتا ہے کہ مشترک جذبات واحساسات کے جتنے پہلو مرثیے میں ہوتے ہیں اتنی کسی صنف میں نہیں۔ میں نے ایک جگہ کہیں اور لکھا تھا کہ یہ وہ صنف ہے جس میں باطن سے خارج تک۔ محبت سے عداوت تک، جبر سے صبر تک اور ایمان سے الحاد تک کالا متناہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔اور یہ سلسلے عوامی زندگی میں کچھ زیادہ ہی پائے جاتے ہیں بس تو پھر کیا۔ حادثہ آلِ رسول کا جو آفاقی ہے اور جغرافیہ مقامی جو انسانی ہے عوامی ہے۔ مرثیے نے مقامیت سے آفاقیت کا سفر ایک ہی جست میں طے کر کیا۔لیکن اس کتاب میں آفاقیت کی تلاش کم ہے مقامیت کی زیادہ اور تحقیق کا یہ عمل ہی درست ہے۔

اب لئیق کیا کہتے ہیں یہ بھی دیکھئے۔

''عوامی مرثیوں کی رنگا رنگی اور اثر انگیزی کے پیچھے صدیوں کا لمبا سفر اور کمائی ہے۔ خیال اور بندشوں کی جوڑ گانٹھ جاری رہی۔ راگ راگینوں نے ان کے تار کسے، وقت کی سان نے ان میں دھار بنائی۔ عمومی طور پر ان میں قافیہ پیمائی تو نہیں لیکن چونکہ یہ گیت گانے کے لئے تیار کئے گئے تھے اس لئے ان میں ایک فطری آہنگ ضرور ملتا ہے۔ ابتدا میں جہاں کچھ گانٹھیں اور کھر دراپن رہا بھی ہوگا۔ گانے والوں نے کھینچ تان کے اسے سروں میں ڈھال لیا ہوگا۔ مختلف المزاج لوگوں نے فکری اور فنّی تجربے ہی نہیں لب ولہجہ کے بدلتے کنیڈوں اور تہذیب ومعاشرت کی اختلاطی صورتوں نے بھی اپنے اپنے طور پر انھیں متاثر کیا تب کہیں نکھر کر سامنے آتے ہیں ان عوامی مرثیوں کے چہرے۔''

لئیق رضوی نے بڑی محنت سے مرثیہ کے عوامی رشتوں اور جذبوں کا ذکر کیا ہے اور جا بجا مثالیں بھی پیش کی ہیں ۔ یہ دکھ بھرے گیت ہیں ،مرثیے ہیں، مکھڑے ہیں، دہے ہیں جو کچھ بھی ہیں لیکن ان میں بقول مصنف:

''ان میں اپنی مٹی کی مہک ہے اور عقیدتوں کے انگنت رنگ بھی، ہر رنگ کے انیک شیڈس۔ عوامی احساس اور جذبوں سے بولتے ہوئے مرقعے یہ گیت وجدان کی ذرانم زمین سے پھوٹے ہیں ۔لوک زندگی، احساس، جذبات اور میلانات سے عبارت ہیں، ان میں نہ کوئی بناوٹ ہے اور نہ کوئی صناعی۔ یہ غمِ حسین کا انتہائی سادہ اور بے ساختہ اظہار ہیں اور یہی چیزیں عوامی مرثیے کو منفرد چہرہ اور شناخت دیتی ہیں۔'' (ص 63)

لئیق نے بھی اُسی سادہ اور آسان زبان میں عوامی مرثیے کی شعریات نیز جمالیات کو قلم سے کم دل سے زیادہ رقم کر دیا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی عوامی مثالیں پیش کر دیں کہ دکھ سے بھرے عوامی چہرے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں ۔ دہی عمومی جذبات پورے معاشرتی میلان اور سادگی کے ساتھ ادا ہوتے ہیں ۔لئیق نے نہ صرف ایسے مرثیے جمع کئے ہیں بلکہ ان کے مزاج ومذاق طبقاتی کیفیت اور انسانیت کے ساتھ جو جلوہ گری کی گئی ہے اس کی وضاحت وصراحت میں اپنے زاویۂ فکر اور انداز بیان میں سادگی رکھی ہے۔ ورنہ عام طور پر نقادان ادب آسان تخلیق کو اپنی مرعوبیت کے چکر میں مشکل تر کر دیتے ہیں۔ لئیق کا یہ مطالعہ تہذیبی، سماجی اور ثقافتی بھی ہے۔ عوامی مرثیوں میں کس کس طرح ارضی ثقافت در آتی ہے اس پر عمدہ گفتگو کی ہے اور قدم قدم پر مثالیں دے کر اپنی گفتگو کو پر اثر اور بامعنی بنایا ہے۔اس پوری کتاب میں یہ چوتھا باب ان معنوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں عوامی مرثیوں کے اصل روپ رنگ سامنے آجاتے ہیں۔

اس کے بعد لئیق نے شمالی ہند میں عوامی مرثیہ، بنگال میں عوامی مرثیہ، دکن میں عوامی مرثیہ پر باقاعدہ الگ الگ ابواب میں گفتگو کی ہے۔ میں مرثیہ کا طالب علم ہوں اور مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ صنف مرثیہ پر فنّی وشاعرانہ گفتگو کم سے کم کی گئی چہ جائیکہ عوامی مرثیے پر جس نوع کی بحث ان ابواب میں کی گئی ہے وہ میں نے اس سے قبل نہیں پڑھی۔ اس میں میری کم علمی کا بھی دخل ہوسکتا ہے لیکن یہ تو ہے کہ مرثیہ پر تہذیبی، سماجی اور عوامی گفتگو ہماری تنقید میں مفقود ہے اس لحاظ سے یہ کتاب نہ صرف تحقیق کی رو سے بلکہ تنقید کی رو سے بھی اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگلے ابواب میں دہا اور زاری پر الگ الگ انداز سے گفتگو ملتی ہے ۔اس سے قبل اظہر علی فاروقی نے اردو کے لوک گیت میں عوامی مرثیہ پر سرسری گفتگو ضرور کی ہے لیکن ان کا رخ کچھ اور ہے اور زاویہ بھی کچھ اور۔ لئیق رضوی راست طور پر عوامی مرثیے پر تفصیلی گفتگو کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے بڑی حد تک اس کی تلافی بھی کی ہے۔ دسویں باب میں ایک بار پھر بعنوان ''اردو رثائی

شاعری پر عوامی ادب کے اثرات'' گفتگو سامنے آتی ہے یہاں بھی پہلا ہی جملہ چونکاتا ہے۔''نوحہ حسین اردو شاعری کی گھٹی میں ہی شامل ہے'اور یہ حقیقت ہے۔ غزل کا شعر ہے۔

آلام روزگار کو آساں بنادیا
جو غم ہوا سے غمِ جاناں بنادیا

اردو شاعری کے دامن میں بھی نوحۂ حسین نوحۂ حیات بن کر راہ نجات کا تعیّن کرتا ہے۔اس آخری باب میں بھی کثرت سے مثالیں ہیں،حوالے ہیں اور پھر یہ نتیجہ۔

''قصہ مختصر یہ کہ اردو رثائی شاعری کا ایک دھارا عوامی لب ولہجہ سے بھی عبارت ہے۔شعراء نے انھیں گیتوں کے رنگ وآہنگ سے سجایا ہے ان میں سادگی کا حُسن اور مٹھاس ہے تو مٹی کی سوندھی سوندھی مہک ہے۔یوں تو اردو شاعری بالخصوص مرثیہ مجموعی طور پر ہندوستانی تہذیب سے قریب ہے لیکن ان اشعار پر یہ چھاپ اور بھی گہری ہے''

اوران جملوں پر کتاب کا خاتمہ۔

''عوامی مرثیوں کی بے پناہ تاثر اور کیفیت نے شعراء کو ان کی طرف متوجہ کیا، عوامی لب و لہجے اور احساسات میں ڈھلی منظومات سامنے آئیں ۔ملک کے ہر حصے میں عوامی لب و لہجے والے یہ اشعار عزاداری میں رنگ گھول رہے ہیں ۔ان میں بلا کی کیفیت ہے، ہر شعر درد کا ایسا نشتر ہے جو سیدھے دل میں اتر جائے۔ضرورت ہے انھیں بچانے اور سنوارنے کی۔'' (ص 164)

لئیق رضوی نے کسی حد تک اسے بچایا ہے اور اس سے زیادہ اس کی اہمیت وافادیت اور کیفیت پر معنی خیز گفتگو کی ہے اور عمدہ کتاب رقم کردی ہے جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نام کتاب : بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ

مصنف : ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری
قیمت : 300 روپے
ناشر : حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر : **ساحر داؤدنگری**
فون : 9868706845

بیسویں صدی کی شروعات میں ہی نوآبادیاتی نظام اور حب الوطنی کی تحریک شروع ہوچکی تھی۔اردو افسانے

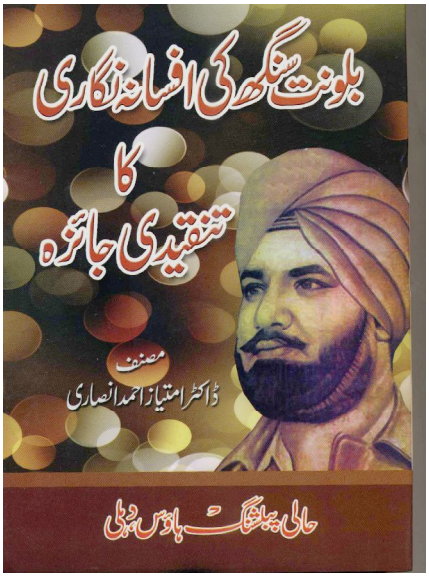

کی شروعات میں سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم جیسے اہم نام سامنے آچکے تھے۔پریم چند بھی افسانوی سلسلہ شروع کر چکے تھے۔مظلوم اور دبے کچلے انسانوں پر خصوصی طور پر لکھا جارہا تھا۔اس عہد کو سماجی حقیقت نگاری کا عہد بھی کہا جاسکتا ہے۔آج اردو افسانے کی شروعات کو ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔پریم چند نے اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں روح پھونکنے کا کام کیا ہے۔اس کے بعد اردو افسانے کے منظرنامے پر کئی نام ابھر کر سامنے آئے۔ 1936 میں ترقی پسند تحریک نے اپنی جڑیں مضبوطی سے جمالی تھیں۔اس تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاروں کا ایک نیا قافلہ ابھر کر سامنے آیا۔ بلونت سنگھ کو آسانی سے اس قبیلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ بلونت سنگھ کا تعلق پنجاب سے تھا۔پنجاب کی زمین ہری بھری اور زرخیز رہی ہے۔ پنجاب کو محبت، اخوت، بھائی چارگی، خوشحالی کا استعارہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر امتیاز احمد انصاری کی کتاب اس لئے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے بلونت سنگھ کے افسانہ نگاری کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔آزادی کے بعد اردو فکشن میں جو چند بڑے نام سامنے آئے ان میں فکری اعتبار سے بھی بلونت سنگھ کے نام کو شامل کیا جاسکتا ہے۔کتاب کے پہلے باب میں بلونت سنگھ کے سوانحی خاکے کو پیش کیا گیا ہے۔یہ تعارف اس لئے بھی ضروری ہے کہ آخر پنجاب میں بلونت سنگھ نے ایسا کیا محسوس کیا جو ان کے تخلیقی محرکات کا سبب ثابت ہوا۔

وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے اور بچوں جیسی نازک مزاجی ان کی طبیعت میں شامل تھی۔وہ حساس واقع ہوئے تھے۔فنکار اکثر حساس اور جذباتی ہوتے ہیں۔پنجاب کی سرزمین کو ویسے بھی محبت کی سرزمین کہا جاتا ہے۔یہاں انسانی رشتوں کی طاقت بھی ہے اور محبت بھی۔ بلونت سنگھ نے جب لکھنا شروع کیا تو یہی پنجاب کی سرزمین ان کے سامنے تھی۔پنجاب کے ہنستے بولتے کرداران کو پسند تھے۔ جگا جیسے انمول کردار کو جب وہ اپنی کہانیوں میں اتارتے تو پورا پنجاب اور پنجاب کی خوشبوان کی کہانیوں میں داخل ہوجاتی۔ڈاکٹر امتیاز نے تنقیدی جائزے میں بلونت سنگھ کی انہی خوبیوں کو سامنے رکھا ہے۔

بلونت سنگھ کے افسانوں کو غور سے پڑھئے تو صرف پنجاب نہیں بلکہ پورا ہندوستان اپنے اصل رنگ میں نظر آتا ہے۔ بلونت سنگھ نے خوفناک غلامی کو بھی قریب سے دیکھا تھا۔آزادی کے بعد کے فسادات سے بھی ان کا سامنا ہوا۔انگریزوں کے ظلم دیکھے۔تاناشاہوں کی خوفناک زنجیروں کو دیکھا بھی اور کہانیاں بھی سنیں۔ پھر آزادی کا سورج طلوع ہوا تو پنجاب کی پانچوں ندیاں خون میں سن گئی تھیں۔پنجاب کے بھی دو حصے ہوگئے تھے۔ بلونت سنگھ کا قلم خون کے آنسو رویا اور تقسیم کی کہانیاں بھی ان کے افسانوں کا حصہ بنتی چلی گئیں۔ بلونت سنگھ کی زبان تخلیقی زبان ہے۔کردار نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ مکالموں کا انداز اس قدر سحر آفریں ہے کہ قاری ان مکالموں کے سحر میں کھوجاتا ہے۔ ڈاکٹر امتیاز نے تنقیدی جائزے کے تحت ان کے مختلف افسانوں کا بخوبی جائزہ پیش کیا ہے۔اس جائزے کو پڑھ کر بھی یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ انہوں نے بلونت سنگھ کے افسانوں کو نہ صرف سنجیدگی سے پڑھنے کی کوشش کی ہے، بلکہ ایک ایسے دور میں جہاں بڑے بڑے ادیب جگمگا رہے تھے،اس دور کا جائزہ لیتے ہوئے بلونت سنگھ کے ادبی مقام کا تعین کرنے کی بھی خوبصورت کوشش کی ہے۔بلونت سنگھ افسانہ نگاری کے 'نئے دھارے' کا نام تھا۔ان کا انداز مختلف اور سب سے جدا تھا۔ بلونت سنگھ کا پنجاب بھی انوکھا تھا اور ان کی ہر تحریر کی بنت اس قدر تخلیقی اور خوبصورت ہوتی ہے کہ قاری سانس روک کر جب تک اختتام تک نہیں پہنچ پاتا، چین نہیں لیتا۔ یہ بھی بلونت سنگھ کی کامیابی ہے۔

امتیاز صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ بلونت سنگھ

کا رنگ و انداز دونوں سے جدا ہے اور بلونت سنگھ کی کہانیوں کا ان سے موازنہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔اس کتاب میں بلونت سنگھ کے افسانوں کو وسیع کینوس میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔آزادی کے بعد بلونت سنگھ کے افسانوں کا جس طرح محکمہ ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہو پایا۔بلونت سنگھ بہت حد تک نظرانداز کئے گئے۔اب امید ہے کہ بلونت سنگھ پر لکھنے کے لئے مستقبل میں نئی راہیں کھلیں گی۔

نام کتاب : تشنہ لب سفر

شاعر : جنوں اشرفی

ضخامت : 176 روپے

قیمت : 300 روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی، علی گڑھ، ممبئی

مبصر : سائرہ عظیم

فون : 9312340686

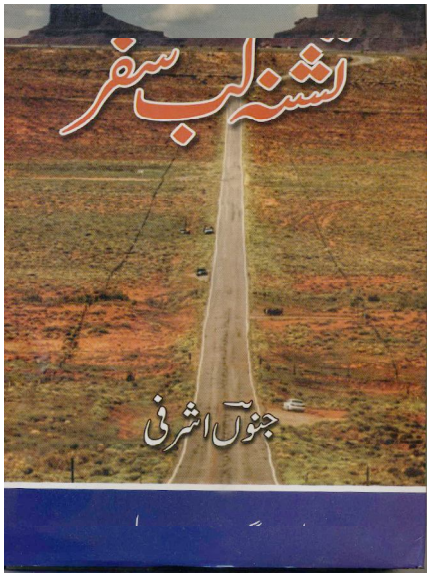

'تشنہ لب سفر' کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ شاعر اپنے مخصوص لب و لہجے سے شعری کائنات کی تخلیق کررہا ہے۔ وہ اپنے تخلیقی جنون سے نمایاں پہچان بنانے والوں میں ایک اہم نام ہے۔ تصوراتی اور جمالیاتی حدود سے باہر نکل کر نئے معانی کی تلاش میں وہ سرگرداں نظر آتے ہیں۔

جنون اشرفی نے اپنی تہذیبی وابستگی اور عمیق مطالعے کے بعد اپنے انفرادی رنگ کو برقرار رکھا ہے۔ان کا لب ولہجہ خالص ان کا ہے۔ان کا دل پزیر اسلوب ان کے قاری کو بے ساختہ اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔سماجی سروکار سے لے کر ہمارے عہد کے سیاسی وسماجی انکشافات ان کے اشعار میں جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس اعتبار سے دیکھیں تو کتاب میں شامل غزلیات میں نئے عہد کی ترجمانی بھی ہے۔ان کے موضوعات میں رنگا رنگی اور تنوع ہے جس کے سبب کتاب کا کینوس وسیع ہوگیا ہے۔ شعر ملاحظہ کریں

گھنے درخت کے سائے کا اہتمام بہت
بغیر برگ شجر کا مگر خیال کہاں

جہاں ہم نے گزارے تھے لڑکپن کے حسیں لمحے
ہمیشہ یاد آتی ہے اسی کھلیان کی خوشبو

عمر گذری تو یہ ہوا معلوم
موت آساں حیات بھاری ہے

اجنبی اجنبی سی ہے دنیا
روپ ریکھا بدل گئی تو نہیں

دستار کب نہ جانے تمہاری اچھال دے
دریا دلی کا شوق نہ اتنا کیا کرو

جسے سن کر لڑکپن لوٹ آئے
وہی قصہ کہانی ڈھونڈتے ہیں

زیرنگاہ مجموعہ ان کے شعری سفر کا دوسرا پڑاؤ ہے۔ اس مجموعے کی غزلیات میں ایک جہان معنی آباد ہے۔ مشاہدات ومحسوسات میں وسعت گہرائی و گیرائی ہے۔ غزل کے خالص جمالیاتی رنگ کے اشعار بھی اس مجموعے میں آب وتاب دکھارہے ہیں۔اس کا ہر ادبی وشعری فعل قاری کو شاعری کی شعوری وفنی کاوشوں سے اجاگر کرتا ہے۔تشنہ لب سفر فکری طہارت، طرز بیان کی جدت وندرت اور تخلیقی قوت کے اظہار سے دلکش مجموعہ ہے اور جنوں اشرفی کے روشن مستقبل کا آئینہ دار بھی۔کتاب صوری ومعنوی اعتبار سے دلکش ودیدہ زیب ہے۔مجھے امید ہے کہ اس تازہ ترین کاوش سے ان کی خاطر خواہ پزیرائی ہوگی۔

نام کتاب : لیکن

مصنف : افضل حسین افضل

ضخامت : 188 صفحات

قیمت : 250 روپے

ناشر : شان پبلی کیشنز، کولکاتا۔16

مبصر : ڈاکٹر محمد طفیل آزاد

قبل اس کے کہ میں اس کتاب پر اپنی رائے کا

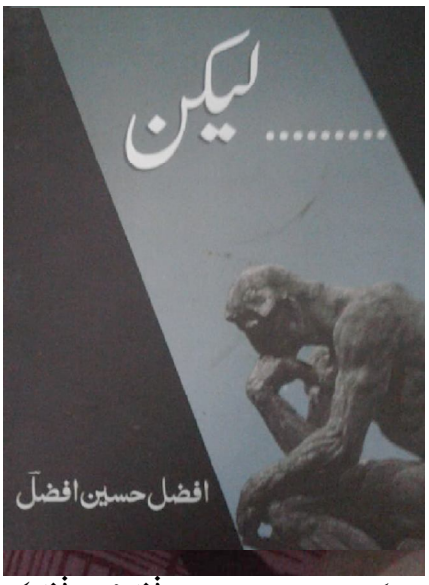

اظہار کروں یہ ضروری ہوگا کہ میں افضل حسین افضل کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتا چلوں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران مجھے یہ پتہ چلا کہ موصوف نے اپنی ذاتی زندگی میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔مثلاً کم عمری میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ جانا اور گھر کی تمام طرح کی ذمہ داریاں ان کے حصّے میں آنا۔لیکن انہوں نے ایک باحوصلہ انسان ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی تمام ذمہ داریوں کو بحسن خوبی نبھایا۔بایں دیگر انہوں نے اپنی تمام طرح کی مصروفیاتِ زندگی کے باوجود اپنا شعری سفر جاری رکھا جو کہ ایک قابل تحسین امر ہے۔

افضل حسین افضل نے اپنی خودنوشتہ تحریر 'آشفتہ بیانی میری' میں اردو سے والہانہ لگاؤ کا ذکر کچھ اس طرح سے کیا ہے:

''دل نے اصرار کیا کہ اردو جیسی زبان میں طبع آزمائی کی جائے اور پھر فیاض احمد خان نام کے ایک ہم عمر شخص سے دوستی ہوئی جو شاعر تو نہ تھے لیکن شاعری کا مزاج داں ضرور تھے۔اس کے علاوہ نواب متین لطیفی جو سخن فہم اور شاعر نواز واقع ہوئے تھے میری شاعری کے تئیں مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔''

زیرنظر کتاب 'لیکن' افضل حسین افضل کا اولین شعری مجموعہ ہے، جس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں اور قطعات شامل ہیں۔کہا جاتا ہے کہ انسانی ذہن و دماغ میں جب افکار وخیالات کی سطح پر ابال آتا ہے تو کسی فن کی تخلیق ہوتی ہے۔افضل کی شاعری کے مطالعہ کے دوران

مجھے مجموعی طور پر دو باتوں کا شدت سے احساس ہوا۔ اول یہ کہ وہ جمالیاتی حس کو اجاگر کرنے میں ماہر ہیں۔ دوئم یہ کہ وہ اخلاقیات کا درس اپنے مخصوص انداز میں دینے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ وہ شہری زندگی کی نفسیات، حالت و کوائف اور تہذیب و ثقافت کی پامالی جیسے موضوعات کو اپنے کلام میں بروئے کار لاتے ہیں، جن سے ان کے شعری محاسن کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ افضل نے زمانے کے متواتر بدلتے ہوئے رخ کا بہ غور مطالعہ کیا اور اسی کا اثر قبول کرتے ہوئے اپنی شاعری کا مزاج بدلا۔ افضل آج کے شعرا کی طرح رنج و غم، حزن و ملال کا رونا نہیں روتے بلکہ ان سے نبرد آزما ہوکر زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں جو کہ ایک خوش آئند بات ہے۔

افضل حسین افضل بنیادی طور پر ایک فطری شاعر ہیں اور ایک فطری شاعر ہونے کے ناطے وہ اپنی شاعری میں انہیں باتوں کو بروئے کار لاتے ہیں جو ان کے افکار و خیالات کی سطح پر آمد کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ غمِ روزگار کے ساتھ ہی ساتھ اگر غمِ عشق میں کوئی شخص مبتلا ہو تو اس کی کیا کیفیت ہوسکتی ہے اس بات کا اندازہ ان اشعار سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے:

شاید کہ پاس میری پریشانیوں کا تھا
شانے پہ اس کے گیسوے خمدار کھل گئے

مسئلہ گھر کی کفالت کا بدستور رہا
خرچ کرتی رہی خود کو گلی گلی خوشبو

افضل کو اپنی غزلیں دل و جان سے پسند ہیں۔ اسی لئے وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

تیرے اشعار میں ندرت ہے افضل
تیری غزلوں کا تیور بولتا ہے

افضل حسین افضل نہ صرف غزل کے شاعر ہیں بلکہ انہوں نے نظمیں بھی خوب کہی ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ دونوں اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بنتِ ابلیس، آمد، لیکن، تصویر کا دوسرا رخ، اندیشہ، سنجیوانی اور عدم شناخت قابلِ ذکر ہیں جو ان کی فنی پختگی کا ثبوت دیتی ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں نئی نئی اصطلاحات و تراکیب کا برمحل استعمال کرتے ہیں جو انھیں دوسرے نظم گو شعرا میں منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔

نام کتاب : جوہی کی مالا

مرتب : ڈاکٹر غضنفر اقبال
ضخامت : 80 صفحات
قیمت : 50 روپے
ناشر : رحمانی پبلی کیشنز، اسلامپورہ، مالیگاؤں
مبصر : **ڈاکٹر قدسیہ نصیر**
فون : 9899004586

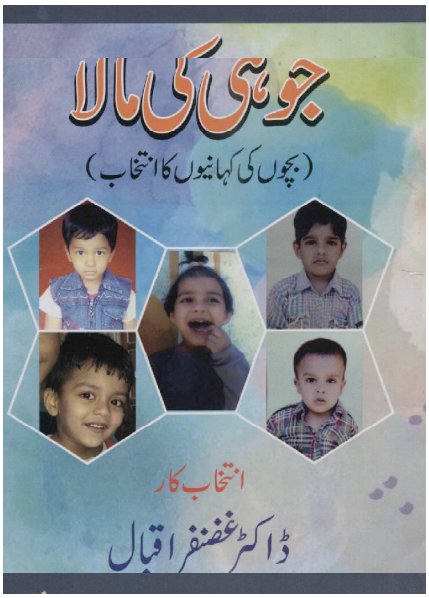

'جوہی کی مالا' بچوں کی کہانیوں کا خوبصورت مجموعہ ہے جسے نوجوان قلم کار ڈاکٹر غضنفر اقبال نے ترتیب دیا ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ عہدِ کمپیوٹر کے بچے کہانی پڑھنا پسند تو کرتے ہیں لیکن جن، بھوت، پریوں کی کہانیاں اور ایک تھا راجہ ایک تھی رانی والی کہانی سے اب بچے اُکتا چکے ہیں۔ بچوں کی نفسیات پر کئے گئے تمام سروے یہ بتاتے ہیں کہ کہانی پڑھنے میں بچوں کی دلچسپی برقرار ہے۔ بس انھیں کہانی ان کی پسند اور دلچسپی کی چاہئے۔ ادب اطفال تخلیق کرنے والے کئی شاعر و ادیب بچوں کی نفسیات اور ان کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے ہیں۔ ایک زمانے میں بچوں کو تھالی کے پانی میں چاند دکھا کر بہلایا جاتا تھا لیکن ہمارے عہد کے چالاک بچے جگنو کی روشنی کو دن میں پرکھنے کی ضد کرتے ہیں۔ اسی لئے اب وہ راجہ رانی اور شہزادے شہزادی کی کہانیوں کے بجائے زندہ اور حقیقی کرداروں کی کہانی سننا اور پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

''جوہی کی مالا'' میں ڈاکٹر غضنفر اقبال نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے جس کی ستائش کی جانی چاہئے۔ وہ مانتے ہیں کہ ادب اطفال کے لئے کہانیاں سچائی اور صداقت کا رزم نامہ ہیں۔ ادب اطفال کی کہانیاں آج شہزادے، شہزادی، بھوت، پریت، پری، جن اور جادو کے اثر سے آزاد ہوچکی ہیں۔ کتاب ''جوہی کی مالا'' کے مرتب نے انھی کہانیوں کا انتخاب کیا ہے جن میں اخلاقی و اصلاحی پہلو بھی ہو اور وہ کہانیاں آج کے بچوں کی ذہنی سطح کو چھونے والی ہوں۔ ایسی ہی کل ۱۳ کہانیاں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں خرم عماد، کلیم ضیاء، منظور وقار، احمد عثمانی، نذیر فتح پوری، حلیمہ فردوس، ایم مبین، مشتاق مومن، وکیل نجیب اور رؤف صادق کے علاوہ نورالحسنین، سلام بن رزاق اور حمید سہروردی جیسے ممتاز افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شامل ہیں۔ ہم عصر افسانہ نگاری کی مختصر ترین فہرست بھی حمید سہروردی، سلام بن رزاق اور نورالحسنین کے نام کے بغیر نامکمل ہے۔ ان ممتاز افسانہ نگاروں نے خالص بچوں کی نفسیات کو دھیان میں رکھ کر 'رٹو طوطو' 'تلاش' اور 'دادی اماں' جیسی کہانیاں تخلیق کی ہیں۔ جو لوگ ہمیشہ اس بات کی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے بڑے لکھنے والے بچوں کے ادب کی جانب توجہ نہیں کرتے انھیں ان کہانیوں کو ضرور پڑھنا چاہئے۔

فاضل مرتب نے کہانیوں کے انتخاب اور ترتیب میں خاصی محنت کی ہے۔ امید ہے کہ اہل نظر حسن انتخاب اور حسن ترتیب کی داد دیں گے۔ کچھ افسانہ نگاروں نے بچوں کے لئے قدرے طویل افسانے بھی لکھے ہیں۔ لیکن اس مجموعے میں طویل افسانوں کو جگہ نہیں ملی ہے۔ مختصر اور مختصر ترین افسانے ہی اس مجموعے میں جگہ پا سکے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ مرتب ڈاکٹر غضنفر اقبال نے مختصر مگر جامع پیش لفظ میں بچوں کی کہانیوں کے حوالے سے دلچسپ اور معلوماتی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں شامل کہانیوں کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ مجموعی طور پر کہانیوں کی یہ کتاب بچوں کے لئے ایک انمول تحفہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوگا کہ ہم بچوں کو ان کے جنم دن پر اس طرح کی کتابیں تحفتاً پیش کیا کریں۔ ☆

علی گڑھ میں
'آجکل'
حاصل کریں
ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
فون: 08439184102

مراسلات

● لمبے وقفے کے بعد 'آجکل' کی بزم میں شریک ہونے کی جسارت کررہی ہوں۔ 'آجکل' میرا محبوب رسالہ ہے۔ طبعی اورادبی عمر کی اس منزل پر کھڑی ہوں جہاں تعریف وتوصیف بے معنیٰ الفاظ بن جاتے ہیں مگر آجکل میں چھپ کر مجھے کچھ ایسی طمانیت کا احساس ہوتا ہے کہ گویا کوئی ایوارڈ ملا ہو۔

افسانہ لکھے زمانہ ہوگیا۔ میں ایسی ہی ہوں، میری تخلیقات کی تاریخ تخلیق اور تاریخ طباعت میں بہت بُعد ہوتا ہے۔ میں جب تک مطمئن نہیں ہوتی چھپنے کے لیے نہیں بھیجتی۔ ویسے پچھلے ڈیڑھ سال سے صحت بھی غیر یقینی رہی۔ اب سنبھل رہی ہوں۔

نومبر کا شمارہ سامنے ہے۔ رسالہ برابر مل رہا ہے۔ اس شمارہ اور ہر شمارے میں مقالات ومضامین کا گوشہ بڑا پرمغز ہوتا ہے۔ اس شمارے کے سبھی مضامین فکر انگیز ہیں۔ بالخصوص ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی کا مضمون 'اردو املا اور مشینی آموزش' بڑا ٹیکنیکل مضمون ہے۔ بڑی عرق ریزی سے لکھا ہوا ہے۔ سبھی مضمون نگاروں کی نگارشات قابل تحسین ہیں۔ افسانوں میں ف۔ س اعجاز کا افسانہ 'من وسلویٰ' اور محترمہ ساحرہ کا 'سنومین' دونوں ہی عبرت کا درس دیتے ہیں۔ وسیم حیدر ہاشمی کا 'کاشی واس' انسانیت کی وکالت کرتا ہے۔ بہرکیف ترقی پسندوں نے ادب میں کمٹمنٹ کا جو نعرہ دیا تھا وہ آج بھی اپنی گھن گرج رکھتا ہے۔

قمر جمالی

ہاؤس نمبر 5-4 ہیما گری نگر کالونی، حیدرآباد

● 'آجکل' نومبر 2018 کا اداریہ میں آپ نے برٹش لائبریری کی عمدہ تصویر کشی کے ساتھ کافی اہم معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ آپ کا تجزیہ مختصر لیکن عمیق اور بامقصد ہے جو مطالعے کی اہمیت اور افادیت کو آشکار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر آپ ہمارے ملک کے کسی اہم کتب خانے کا مختصر جائزہ بھی پیش کردیتے تو اس بات کی وضاحت اچھی ہوجاتی کہ ہمارے یہاں پبلک لائبریری کی مقبولیت میں بتدریج کمی اور مطالعے سے عوام کی عدم دلچسپی کے آخر اسباب کیا ہیں؟

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے 'نہرو، بچے اور ادب' میں ادب اطفال سے متعلق نہایت فکر انگیز نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے بچپن کی معصوم یادوں کو انہوں نے دلچسپ اور منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن موصوف کا یہ خیال درست نہیں کہ ''.....بچوں کا یہ ادب مقداری تو ہے لیکن معیاری پر ایک بڑا سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔'' اردو ادب میں معیار قائم کرنا نقادوں کا فرض منصبی تسلیم کیا جاتا ہے اور خیر سے اعلیٰ پایہ کے تنقید نگاروں نے جاسوسی ادب کی طرح بچوں کے ادب کو کبھی لائق توجہ سمجھا ہی نہیں۔ بچوں کے ادیبوں اور شاعروں کی جانفشانی کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ کوئی ادیب بچوں کے لیے خواہ کتنا ہی دلچسپ اور عصر حاضر سے ہم آہنگ تصنیف کیوں نہ پیش کرے اس کی وہ پذیرائی ہرگز نہیں ہوسکتی جو بہت سے مبہم، عام فہم سے بالاتر اور سوقیانہ ادب تشکیل کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ انگریزی اور دیگر یوروپین زبانوں میں صدیوں پہلے تحریر کی گئیں پریوں کی کہانیاں Fairy Tales نیز ساعت خواب کی کہانیاں یعنی Bed Time Stories آج بھی شہرۂ آفاق ہیں۔ بچوں کے لیے سب سے زیادہ لکھنے والی مصنفہ اینڈ بلائیٹن (Erid Blyton 1897-1968) اور ڈنمارک کے معروف ہینس کرسچن اینڈرسن 1805-1875 کی کہانیوں کا سائنس و ٹیکنالوجی وغیرہ سے دور کا بھی سروکار نہیں۔ لیکن ان کا شمار خالص ادب عالیہ میں کیا جاتا ہے لہٰذا وہ اور ان کی ہی طرح کے بہت سے مصنفین آج بھی عظیم اور زندہ وجاوید ہیں۔ آج کمپیوٹر کے عہد میں مغرب میں بچوں کے لیے جادو ٹونے، بھوت پریت اور چڑیل کی کہانیوں نے شہرت ومقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے ہیں۔ جے کے

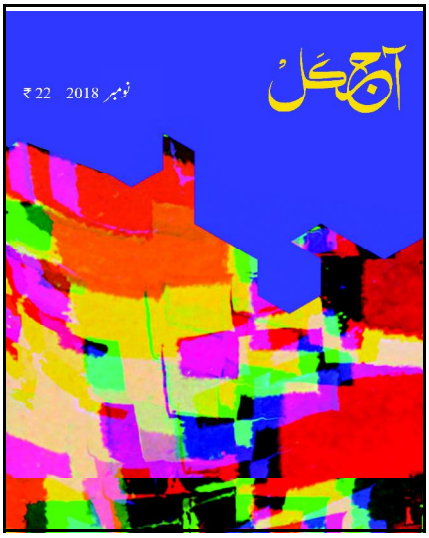

رولنگ کے ہیری پوٹر سیریز کی مثال کافی ہوگی۔ کیا اردو میں ایسی جرأت کرنے والے کی کوئی ہمت افزائی ہوسکتی ہے؟

مقالات میں پرویز احمد اعظمی کا ''اردو املا اور مشینی آموزش'' نہایت محنت سے تحریر کیا گیا حد درجہ معیاری اور قابل ستائش مقالہ ہے۔ دیگر مقالات بھی عمدہ اور محققانہ ہیں۔ افسانوں اور منظومات کا انتخاب بھی پسند آیا۔

نشاط اسلم

nashataslam@gmail.com

7836954769

● 'آجکل' کا نومبر کا شمارہ دیدہ زیب مختلف رنگوں کی بوقلمونی سے لیس اور معیاری مضامین و دیگر مشمولات سے لبریز منظر عام پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس بار کے اداریہ میں لندن کی برٹش لائبریری اور انڈیا آفس ریکارڈز کی بابت مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس بار افسانوی حصہ بھی خاصا توانا اور احسن ہے۔

'انشا' مؤقر مجلّہ کے مدیر و افسانہ نگار ف۔ س۔ اعجاز کے افسانے 'من وسلویٰ' کا عنوان ہی غیر موزوں ہے، لیکن اس کے عین برعکس افسانہ ایک جاندار تخلیق ثابت ہوتی ہے۔ افسانے میں غریب گداگروں کی حرکات وسکنات اور ان کی فطرت و جبلت کا نقشہ حقیقی حیات پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ افسانے کا اختتام طنزیہ اس مفہوم کی خط کشی کرنے والا ہے کہ مذہبی مقامات کے باہر موجود رہنے والے بھکاریوں کو جب بیٹھے بٹھائے بقیہ مہنگا کھانا میسر ہوجاتا ہے، تب ان کے مختلف ردعمل

ضرورت مندوں و بانٹنے کے نیک ارادے سے ہیرو انور دردر تو ضرور بھٹکتا نظر آتا ہے، جب کہ وہ اپنے ہی پڑوس میں بھوکوں مرتے ہوئے دوست رضی بھائی کے نا مساعد حالات کے موجب بھوگی جا رہی اس بیچارے کی معذرت وبھکمری سے انجان ہی رہتا ہے۔

وسیم حیدر ہاشمی کے افسانے 'کاشی واس' کے موزوں عنوان سے یاد آیا کہ مرزا غالبؔ 'بنارس (کاشی) کو 'کعبۂ ہند' کہا کرتے تھے۔ فی زمانہ کسی بھی ایماندار شخص کی بطور استثنا ایمانداری اور انسان دوستی کے ساتھ مزید بغیر کسی بھی خود غرضی کے عوامی فلاح کے کام متواتر انجام دیتے ہوئے دیکھ کر دنیا والے اسے اکثر اپنی مطلب پرست دنیا سے بعید ایک ابنارمل شخص ہی اعلان کر دیا کرتے ہیں۔ بلا شبہ ایسے اشخاص اگرچہ بموجب ضرب المثل 'آٹے میں نمک کے برابر ہی ہوا کرتے ہیں، تاہم اس استثنا کے باوصف اللہ کے ایسے بندوں کی ہی بدولت یہ دنیا قائم مقام ہے اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آگے مستقبل میں بھی رہے گی۔ اس افسانے کا یہی قابلِ مدح سبق آموز موضوع ہے۔

ڈاکٹر ارشد اقبال کا افسانہ 'شوروم' بھی ایک اعلیٰ وارفع تخلیق ہے۔ اس میں عموماً فرسودہ مانے جانے والی روایات کو ہی ہیرو خارجی دکھاؤں کے برعکس مانا کرتا ہے۔ آج کل ہر ایک شخص اُس جدیدیت اور اس سے مملو خیالات کا ہی حامی نظر آتا ہے، جس کی جانب عنوان 'شوروم' کے توسط سے معقول و موزوں کنایہ بھی کیا گیا ہے۔ جدید فکریات سے دوری بنائے رکھنے کی اشد ضرورت کی معنی خیز افادیت کو ہی یہ افسانہ نشان زد کرنے والا ہے۔

محترمہ نورالعین ساحرہ کے افسانے 'سنومین' میں ہیرو ضمیر کا اپنی محبوبہ سوزن سے بالآخر موہ بھنگ ہو جاتا ہے اور وہ حسبِ توقع اپنی وفادار اہلیہ آرزو کی جانب رجوع تو کرتا ہے، لیکن تب تک وہ حالات کی مار سہنے کے بعد خود کفیل اور مختار ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے بچے اپنے والد سے کبھی سنومین نما کھلونوں کو حاصل کرنے کی خواہش کیا کرتے تھے اب وہی والد برفیلے موسم کے نتیجتاً برف کے ڈھیر تلے دب کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے۔ اس کی لاش اس کے اپنے ہی بچوں کے تئیں اب ایک 'اصلی بڑا والا سنومین' (بموجب عنوان) بن چکی ہوتی ہے۔ اس طرح یہ افسانہ اپنے دردناک المیہ کے ساتھ ہی عروج کی معراج تک پہنچتا ہے۔ حیف! تاعمر اس کی ناپسندیدہ اہلیہ آرزو جیتے جی اپنے خاوند کی ٹریجڈی کی بھی قطعی 'دیدہ ور' نہ ہو سکی تھی۔ اس تخلیق میں اول تا آخر برفیلے موسم کی عکاسی نہایت لائقِ صد ستائش ٹھہرتی ہے۔ یہ اس افسانے کا ایک اہم جمع نقطہ (پلس پوائنٹ) بھی گردانا جا سکتا ہے۔

اس شمارے کے تحت حالانکہ تمام تر مضامین عمدہ و بلند پایہ ہیں، تاہم یہاں اردو زبان کی مطلوبہ تدریس سے وابستہ ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی کے مضمون 'اردو املا اور مشینی آموزش' کی اشاعت قابلِ صد ستائش ہے، کیونکہ اردو کے تمام تر رسائل میں اس نوعیت کے مقالوں کا اکثر فقدان ہی رہتا ہے۔ اس مقالے میں اردو زبان اور اس کے قواعد، بالخصوص املا اور اس کی مشینی تدریس کو اور لفظ کی مانند معدودے چند مثالوں کے ساتھ ان کے صرف ونحو کو بخوبی واضح کیا گیا ہے۔

اگرچہ 'شمارندہ' اور ''جالبین' الفاظ بالترتیب بہ معنی 'کمپیوٹر' اور 'انٹرنیٹ' ابھی اتنے زیادہ مروج نہیں ہو پائے ہیں، تاہم بتدریج ان کا بھی تصرف ہو سکتا ہے۔ صفحہ 21 اور 22 پر 'حد' جیسے چند واحد مؤنث الفاظ کا جمع (حدود) کرنے پر مذکر ہو جانے کی بھی ایک خاص بات کی گئی ہے۔ صنف، قِسم، رسم، بحر، دلیل الفاظ بھی فی الاصل مؤنث الفاظ بھی جمع کرنے پر (اصناف، اقسام، رسوم، بحور، دلائل) مذکر ہو جایا کرتے ہیں۔ قواعد پر مبنی یہ حقیقت نہ جاننے والے ادبا کی تحریروں میں ان کا تصرف تا حال بطور مونث ہی کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح اگرچہ 'حال' اور 'تاریخ' الفاظ فی الاصل واحد الفاظ ہی ہیں، تاہم انکے جمع الفاظ بالترتیب 'احوال' اور 'تواریخ' کا استعمال تا حال بطور واحد ہی ہوا کرتا ہے۔ امید ہے کہ آپ مستقبل میں بھی ایسے از حد مفید لسانی زمرے کے مقالوں کی اشاعت کیا کریں گے۔

کرشن بھاؤک

201-A, گلی نمبر 18-K, گورونانک نگر، پٹیالہ (پنجاب)

● 'آجکل' ماہ نومبر 2018 کا شمارہ میری نظروں میں جاذب نظر ٹھہرا۔ اداریہ بھی آپ کا قابل غور اور پرمغز ہے۔ مضامین اور تخلیقات اس شمارے کے بہتر انتخاب ہیں۔ ٹیگور کا فلسفۂ حیات، ڈاکٹر منظر اعجاز کی اچھی تحریر ہے۔ انہوں نے ٹیگور کی شاعری پر اظہار خیال کر کے قارئین تک پہنچانے کی سعی کی ہے جو قابل ستائش ہے۔

ٹیگور کی تحریروں پر اردو زبان وادب کے اثرات۔ عبدالرزاق زیادی کی تحریر میں ٹیگور پر گیتانجلی کے حوالے سے ان کی شاعری پر اپنے خیالات ظاہر کر کے اقبال اور دیگر شعرائے اردو پر تبصرہ پیش کر کے ان کی شاعری کی شناخت کرائی ہے۔ جو بالکل صحیح معنویت کے لحاظ سے نمایاں ہیں۔ یہ ان کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ سنبھل کے چند قدیم شعرا، ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی کے مضمون میں سنبھل کے شعرا پر اچھی خاصی جستجو کر کے ان کی شاعری کو عوام تک لانے کی پوری ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ یہ ابھی کے دور میں فارسی اشعار پر پوری گہرائی سے تشریح کر کے ظاہر کرنا کم بڑی بات نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی صلاحیت کی بدولت حتی الامکان پوری محنت کی ہے جو بالکل صحیح نظریہ ہے۔ جے پرکاش یونیورسٹی چھپرہ میں اردو تحقیق کی رفتار۔ ڈاکٹر نبی احمد نے اردو کے حوالے سے بہتر تحقیقی خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کیے ہیں۔ اردو املا اور مشینی آموزش۔ ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی نے بھی اردو کی خصوصیت کو اردو املا کی نشاندہی کر کے اردو زبان کو صحیح راہ پر لانے کے لیے پوری توجہ دی ہے اور صحیح جگہ استعمال کرنے کی راہ دکھائی ہے۔ اگر سبھی لوگ اردو پر توجہ دیں تو میں سمجھتا ہو کہ اردو کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اردو ان دنوں بالکل کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس پر ہم لوگوں کو بچوں کی تعلیم کے زمانہ ہی میں اس کی اصلاح کرنی چاہئے۔ تب ہی اردو ایک خاص مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اب اردو کا رجحان بدل چکا ہے۔ ہندی اور انگریزی ذہن پہ حاوی ہیں۔

اردو میں ادبی صحافت کے مسائل۔ اکرم وارث نے بھی اپنے مضمون میں ہندوستان کی زبانوں کا ذکر کیا ہے اور صحافت کے مسائل پر ادبی رسائل کا ذکر کیا ہے۔ بہار کی اردو کی درسی کتب کا تجزیاتی مطالعہ۔ محترمہ رضوانہ بیگم کی تحریر نے اچھی روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے درسی

کتابوں کا اچھا خاصا ذکر کیا۔

افسانوں میں من وسلویٰ (ف۔س اعجاز)، کاشی واسی (وسیم حیدر ہاشمی) شوررروم (ڈاکٹر ارشد اقبال)، سنو مین (نورالعین ساحرہ) اپنے لحاظ سے قابل قبول افسانے کہے جائیں گے۔ یہ سبھی صاحبان مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کتابوں کے مبصر صاحبان کے تاثرات بھی قابل قدر ہیں۔ سہیل انجم کا مضمون قابل قدر ہیں۔ سچا پبلشر اور خادم اردو بھی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ جیلانی بانو اور پروفیسر اسلم آزاد کے مضامین بھی بہتر ہیں۔

منظومات میں محترمہ عفت زریں بعنوان 'نہ تم مکمل نہ ہم مکمل' اچھی معلوماتی نظم ہے۔

سبھی شعرا حضرات میری طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جن کے اسمائے گرامی ہیں۔ ذوالفقار حسین اثر، انور ادیب، سلطان ساجد، رام داس، عندلیب زمانی، مدہوش بلگرامی، ڈاکٹر اعجاز پاپولر، ابرار رحمانی صاحب نے چچا نہرو کا ذکر کرتے ہوئے بچوں کے سلسلے میں کارآمد باتیں تحریر کی ہیں۔ ابرار صاحب کی تحریر سے پتہ چلا ہے کہ آجکل میں آٹھ دس صفحات بچوں کے لیے مخصوص کئے گئے تھے جو کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔

ماہ نومبر میں شامل میری غزل میں مقطع کے شعر میں 'یہ' کی جگہ 'یک' شائع ہوگیا ہے۔ اصل مقطع یوں ہے:

ڈر مجھ کو رہا کرتا ہے یہ کفر کا ہمسر
بندوں کے قریب سر کو جھکایا تو نہیں ہے

همسر صدیقی

مسری گھراری، سمستی پور (بہار) 848101

● 'آجکل' دستیاب ہوا۔ سنبھل کے کچھ پرانے زمانے کی فارسی زبان وادب کے معیاری شاعروں کے دلکش اشعار پڑھ کر مجھے نہایت شادمانی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی کو ایک اچھا مقالہ لکھنے پر مبارکباد۔ من وسلویٰ افسانہ پسند آیا۔ ف۔س اعجاز قابل داد ہیں۔ ڈاکٹر منظر اعجاز، ڈاکٹر نبی احمد، پرویز احمد اعظمی، اکرم وارث، رضوانہ بیگم، وسیم حیدر ہاشمی، ڈاکٹر ارشد اقبال، نورالعین ساحرہ، اعجاز پاپولر میرٹھی، آچاریہ وعلامہ ڈاکٹر رام داس، راج کمار، دلیپ کمار کپور، جیلانی بانو، عفت زریں، سہیل انجم، ڈاکٹر نشاں زیدی وغیرہ کے خیالی وتنقیدی زاویے اور آپ مدیران صاحبان کے ادارتی فہم ودانش وادراک قابل داد ومبارکباد ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں غور وفکر کی دعوت دینے والے مخصوص واہم نظریے نیز جائزے ہیں۔

جاوید اشرف قیس فیض اکبر آبادی

● ماہِ ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ ہر بار کی طرح یہ شمارہ بھی اپنے مضامین ومقالات کی وجہ سے دھیان کھینچنے میں کامیاب رہا۔ خاکسار اداریہ پر بالکل بھی بات نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ ''آجکل'' کی پہچان اس کا اداریہ بھی رہا ہے اور رہے گا۔ پہلا مضمون جناب نریش صاحب کا ''جدید ہندی شاعری میں اردو کے ضمنی قصے'' ہے۔ کئی معنوں میں یہ مضمون اہم ہے تاہم چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا پیراگراف لائن نمبر 14 پر لکھتے ہیں ''کعبہ بنانے کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو حکم ہوا تھا کہ تم قیامت تک لوگوں کو حج کے لئے پکارو، انہوں نے پکارا تھا اور حاجیوں نے جواب میں لبیک کہا تھا تب ہی سے لبیک کہنا ہنوز جاری ہے'' یہ تلمیح اتنا ہی غلط ہے جتنا حسن یوسفؑ بول کر ''قلوپطرہ'' مراد لیا جائے۔ اس لئے صاحبِ مقالہ سے گزارش ہے کہ سورہ البقرہ کی آیت نمبر 127 سے 129 کا ترجمہ مطالعہ کیا جائے یا بخاری شریف میں کتاب الحج کو پڑھا جائے معلوم ہوگا کہ اس کا سرا نبیؐ سے جڑتا ہے نا کہ حضرت ابراہیمؑ سے۔ پانچویں پیراگراف میں لکھتے ہیں ''پیغمبر حضرت محمدؐ سے 10 نومبر 571 کو مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے 33 برس دعوت اسلام دے کر 8 جون 622 کو مدینہ میں واصل بحق ہوئے''۔ جب کہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ آپؐ 10 برس مکہ میں اور 13 برس مدینہ منورہ میں قیام فرمایا: یوں کل مدتِ تبلیغ 23 سال رہی۔ حوالہ کے لئے کسی بھی سیرت کا مطالعہ کیا جائے۔ یہی حال منصور حلاج والی تلمیح کا بھی ہے زیادہ جانکاری کے لئے ''افادات سلیم'' از مولانا وحیدالدین سلیم کا مطالعہ کیا جائے بہتر ہوگا۔

اس شمارہ میں شمیم طارق کا قلم ہمیں بنارس کی سیر کراتا ہے جب کہ آل رضا کا مرثیہ پر بات کرتے ہوئے لئیق رضوی نے اچھا لکھا ہے۔ بیانیہ شاعری پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر فرحت رضوی نے عمدہ مضمون ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس کے لئے انہیں مبارکباد۔ ''مالک رام کی تحقیقی کاوشیں'' پر لکھتے ہوئے قدسیہ عظمت رقمطراز ہیں ''ادب میں نذر پیش کرنے کی روایت مالک رام صاحب کی ہی قائم کردہ ہیں'' یہ جملہ اردو ادب کے حوالہ سے ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی ہی جدیدیت کا نقشِ اول ہیں اور ''شب خون'' اس کا ترجمان۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ 'شب خون' میں زیادہ تر اسی قبیل کے مضامین کو جگہ ملتی تھی۔ تاہم اس سے پہلے بھی جدیدیت پر مضامین لکھے جا چکے تھے۔ معصوم مرادآبادی کا مضمون نہایت مبسوط اور وقیع ہے۔ حالانکہ اولین شہید آزادی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تاہم ایک نئے زاویہ سے مضمون نگار نے اپنے قلم کو جولانی عطا کی ہے۔ افسانوں میں تینوں افسانے عمدہ ہیں تاہم ''خالی بوتل'' کا مطالعہ زیادہ اچھا لگا۔ اس مرتبہ بارہ غزلوں کو جگہ ملی ہے۔ لیکن اظہار وارثی کا یہ شعر دل کو بھا گیا۔

چاہتیں، خواب، جستجو، امید
ان دواؤں سے فائدہ ہے مجھے

اسعدا للہ

جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

● 'آجکل' کا تازہ شمارہ خریدا، پڑھا، محظوظ ہوا پھر میں نے آپ حضرات کو اپنی رائے تحریر کرنا ضروری سمجھا۔ رام داس کی ایک عدد عمدہ غزل کے معیاری اشعار پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ان کی غزل کے مقطع میں 'مغموم' لفظ آپ کے کمپیوزر یا کاتب محترم کی ستم ظریفی کے باعث شائع ہی نہ ہوسکا یا چھوٹ گیا؟

آپ کے رسالہ میں 'بہار' کے لوگوں پر خصوصی بلکہ زیادہ توجہ دینی ضروری تو نہیں؟ بھئی دیگر علاقوں کے قلمکار اور دوسرے فنکار بھی مخصوص ہیں، ان حضرات پر بھی آپ لوگ دھیان دیں۔

اردو زبان وادب کے فروغ، نشر واشاعت میں پنجاب، ہریانہ، آندھرا، اتر پردیش، جموں وکشمیر وغیرہ کے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور ہنوز لے رہے ہیں لہٰذا ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی میں ان ریاستوں کے قلم کاروں کو چھپنے چھپانے کے مواقع زیادہ دیے جائیں اور جھارکھنڈ، اوڈیشہ، ہماچل پردیش، آسام، بنگال وغیرہ جیسے دیگر صوبوں کے قلمکاروں کو بھی زیادہ چھاپا جائے۔ میری یہی صائب رائے ہے۔

'آجکل' کے تازہ شمارہ میں حسن ضیا کا تحریر کردہ

اداریہ بے حد پسند آیا۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی، اسعد اللہ، عفت زریں وغیرہ کی تحاریر و تخالیق بھی اچھی لگیں۔

خدیجہ خاتون

رانچی پہاڑی، رانچی

● 'آجکل' کے تازہ شمارہ میں ف۔س اعجاز کا افسانہ 'من وسلویٰ' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ غالباً اپنے موضوع پر یہ پہلا افسانہ ہے جس میں عالم انسانیت کی ایک بنیادی حقیقت کو مربوط کیا گیا ہے۔ آج کی دنیا میں تمام فاصلے سمٹ گئے ہیں لیکن انسان کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کی خبر ہی نہیں ہے کہ وہ کس حال میں زندہ ہیں۔ بعض ناقدین ادب خصوصاً ترقی پسندوں نے سوویت روس میں لکھے گئے افسانوں کو اعلیٰ اور معیاری قرار دیا تھا۔ اس کے بعد فرائڈ کے مقلدین نے ادب میں نفسیاتی افسانے لکھ کر جگہ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن عالم انسانیت کو بلند اخلاقی قدروں کے تعین میں اپنا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ پریم چند، کرشن چندر اور رابندر ناتھ ٹیگور کے علاوہ کوئی ایسا افسانہ نگار نظر نہیں آتا کہ جس نے حکایتی افسانے لکھے ہوں۔ حالانکہ حکایتی اسلوب و بیان میں افسانہ کی بنیادی ضرورت ہے۔ ورنہ تاثیر کا جوہر پیدا نہیں ہوتا۔ زیادہ تر مغربی افسانہ نگار خواہ موپاساں، چیخوف اوراوہنری کیوں نہ ہوں۔ اخلاقی طور پر تنقید تو ضرور کرتے ہیں لیکن زندگی کی مثبت قدروں سے انحراف بھی صاف طور پر نظر آتا ہے۔ انگریزی ادب کے سیکڑوں افسانے پڑھ جایئے دو ایک افسانے ہی معیاری ہوتے ہیں۔ اوہنری کے بعض افسانوں میں حکایتی اسلوب و بیان کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں ناقدین ادب ان ہی افسانوں کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کی تنقیدی انا کو تسکین دے سکیں۔ اردو افسانہ داستان اور غزل کی سی انفرادیت رکھتا ہے۔ جس کی کوئی نظیر دنیائے ادب میں ناپید ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر اچھا لگتا ہے کہ پریم چند اور کرشن چندر کی دور رس نگاہیں جدید افسانوں میں بھی در آئی ہیں۔ خاص طور پر منظر نگاری میں تفکرات نقد و نظر کی وسعت بھی ہے اور صداقت احساس کا حسن بیان بھی۔ ورنہ حقیقت پسندی کے مادیاتی تصورات نے امیجری اور استعارہ سے اس کی زرخیزی چھین کر اسے نفس امارہ کی ترجمانی میں لگا دیا تھا۔ یہ طلسم اب ٹوٹ رہا ہے۔

ڈاکٹر محمود شیخ

592، نیا محلّہ مرزا غالب مارگ، جبل پور

● نومبر 2018 کا آجکل نظر نواز ہوا۔ اداریہ بعنوان 'سفر ہے شرط' کی منفعت بخش تحریر نے دل و دماغ کو سیر حاصل بنا دیا. اداریہ کا یہ فقرہ لائق تائید ہے، گر زندگی میں فرصت و فراغت میسر ہو اور ذہن غم روزگار سے خالی ہو تو کتب خانوں میں بیٹھ کر پوری عمر گزاری جا سکتی ہے۔ اداریہ میں لندن میں واقع برٹش لائبریری کے تعلق سے اتنی قیمتی معلومات فراہم کرانا یقیناً سمندر کو کوزہ میں بند کرنے جیسا ہے اس کے لئے میں خامۂ مدیر کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔

تبصرے کے کالم میں محترم شکیل سہسرامی پٹنہ، کے شعری مجموعہ، آوارجہ؛ پر خان محمد رضوان صاحب کا تبصرہ پڑھکر خوشی ہوئی، علاوہ ازیں تمام مبصرین حضرات تحسین و تعریف کے مستحق ہیں۔ صفحہ نمبر 3 کی فہرست میں تبصرے کی تفصیل میں شعری مجموعہ آوارجہ، شکیل سہسرامی کا درج نہیں ہونا انتہائی افسوس کی بات ہے۔ میں تمام قلمکاروں کو ان کی عمدہ تخلیقات کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد شکیل خاں

نزد رحمان مسجد، سمن پورہ، راجہ بازار پٹنہ 14

● 'آجکل' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی اشاعت سے لے کر اب تک اس کا معیار ہمیشہ بلند رہا۔ اکتوبر کا شمارہ اس کی تازہ مثال ہے۔ نند کشور وکرم کا مضمون 'خلافت تحریک اور مہاتما گاندھی' نے میری معلومات میں کافی اضافہ کیا۔ موصوف جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں۔ عارف نقوی اور پروفیسر علی جاوید کے مضامین 'پروفیسر کنور اشرف' اور 'عقیل صاحب' ان دونوں شخصیات کی زندگی کے بعض نئے گوشوں سے آشنا کراتے ہیں۔ ہاں پی پی سریواستوا رند کا مضمون 'جلیاں والا باغ' کا ایک چشم دید رتن بائی مطبوعہ ہے۔ یہ 'نیا دور' لکھنؤ کے اگست 2018 کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔

شمیم اعظمی

الٰہی باغ، نزم آغا مسجد، گورکھپور

☆☆☆

ماہنامہ

'آجکل'

کا سالانہ چندہ

ماہنامہ 'آجکل' (اردو) کے

سالانہ چندہ کی شرحیں حسب ذیل ہیں:

سادہ ڈاک سے

رسالہ منگانے کے لیے

سالانہ	230 روپے
دوسال کے لیے	430 روپے
تین سال کے لیے	610 روپے

رجسٹرڈ ڈاک سے

رسالہ منگانے کے لیے

سالانہ	434 روپے
دوسال کے لیے	838 روپے
تین سال کے لیے	1222 روپے

سالانہ چندے کی رقم بذریعہ پوسٹل آرڈر/ ڈیمانڈ ڈرافٹ بنام ڈائریکٹر جنرل پبلی کیشنز ڈویژن قابل ادا، نئی دہلی ارسال کریں۔ آن لائن ادائیگی کے لیے ملاحظہ کریں ویب سائٹ۔

www.publicationsdivision.nic.in

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن

کمرہ نمبر 56، سوچنا بھون، سی۔جی او کمپلیکس،

لودھی روڈ، نئی دہلی۔110003

فون نمبر:

011-24367260----24365609

ذرا ہوش آیا تو دوسروں کے مرثیے پڑھنے کے بجائے اپنے مطالعے کو سہارا بنا کر ذاکری شروع کی۔عشرہ محرم میں میں نے ڈیڑھ ڈیڑھ سو مجلسیں اس وقت پڑھی ہیں جب ہائی اسکول بھی پاس نہ کیا تھا۔یہ میری تقریری صلاحیت کی پہلی اور سب سے اہم درسگاہ تھی جس نے کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں ہر تقریری مقابلے اور مباحثے میں مجھے پہلا انعام دلایا۔بڑے سے بڑے مجمع اور شوخ سے شوخ تر سامعین کے ہجوم نے کبھی مجھے ہراساں نہیں کیا۔یہی خود اعتمادی لیکچرر ہونے کے بعد بڑی سے بڑی کلاس کو قابو میں رکھنے کے کام بھی آئی۔

بچپن سے میں نے جس شہر کو دیکھا اور اپنا وطن سمجھا وہ ریاست حیدرآباد کا شہر اورنگ آباد ہے، جہاں میں پیدا ہوا، پلا بڑھا اور انٹر تک تعلیم حاصل کی۔میرے سماجی، سیاسی، ادبی شعور نے یہیں آنکھ کھولی۔مطلق العنان ریاست کے ماحول میں ایک ہی ڈھرے پر چلتی ہوئی بے رنگ، جدوجہد اور تلخ تجربات سے بھرپور بچپن کی زندگی اچانک ایک انقلاب سے اس وقت دوچار ہوئی جب پولیس ایکشن کے ساتھ حیدرآباد کا آزاد ہندوستان سے الحاق ہوا۔جاگیردارانہ تہذیب میں معائب کے ساتھ ساتھ کچھ قابل قدر خوبیاں بھی تھیں۔وہ طرز معاشرت جو سیکڑوں سال کے تہذیبی ارتقا اور ہند ایرانی اثرات کی پروردہ تھی، اپنے اندر ایسے اقدار بھی رکھتی تھی، جو موجودہ معاشرے میں کمیاب ہوتی جارہی ہیں۔اس دور کا بیکار اور طفیلی معزز حاکموں کا طبقہ آج اسی قماش کے سیاستدانوں کے طبقے کے لیے جگہ خالی کر چکا ہے۔فرق یہ ہے کہ ان کے پاس وہ اقدار بھی نہیں جو دور گزشتہ کے اشرافیہ میں انسانیت، شرافت، وضعداری اور مروت کی روح بھی کبھی کبھی پھونک دیا کرتی تھی۔پولیس ایکشن کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوا کہ ایک ہی دھچکے سے صدیوں کی تعمیریں آن واحد میں خاک کا ڈھیر ہوگئیں۔وہ سماجی و سیاسی نظام جو صدہا سال میں بنا تھا، وقت کے ایک تھپیڑے کی تاب نہ لاسکا۔اس زمانے میں اپنے طفلانہ شوق کے ہاتھوں میں روزنامچہ لکھا کرتا تھا، جس میں اس تبدیلی کا نوحہ بھی لکھا اور نئے نظام کی پذیرائی بھی کی۔میں نے جس زندگی کو حقیقت سمجھ کر دیکھا تھا، سراب نکلی، جس میں جاگیردارانہ ماحول میں خود کو بے سروساماں محسوس کرتا تھا۔وہ اتھل پتھل ہوگیا، لیکن اس کی جڑیں میرے وجود میں بھی پیوست تھیں۔مستقبل کے بہت سے خواب ٹوٹ گئے اور حال کی تصویریں یکسر بدل گئی۔اس وقت میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔جذباتی وابستگیاں مذہب کے ساتھ اس نظام سے بھی تھیں جس نے میرے آباواجداد کی تہذیب کے مخصوص تصورات کی تشکیل کی تھی۔ایسے انقلابوں کا مادی سطح پر ہم ایسے بے سروسامان افراد پر کیا اثر پڑسکتا تھا جو کھونے اور لٹانے کے لیے کچھ رکھتے ہی نہ تھے۔البتہ ذہن کی دنیا نئے اثرات سے روشناس ہوئی۔دوسال بعد کالج میں داخل ہوا تو وسیع تر دنیا سے سابقہ پڑا۔سینئر ادیبوں، شاعروں کا قرب، سماجی اور سیاسی تحریکوں سے براہ راست تعارف، عالمگیر انصاف اور انقلاب کے خوابوں سے ملاقات، صداقت کی تلاش کے جذبے کی اولین خلش، پرانی اقدار و روایات کے گہوارے میں پلنے والے تصورات پر شک کی پرچھائیاں۔اتنے بہت سے داخلی اور خارجی واقعات کی ذہن پر یورش ہوئی تو مجھے اپنا وجود خود بخود وسیع تر ہوتا اور نمو پاتا اور روشن ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔یہ زمانہ ذہنی کشمکش کا وہ کرب انگیز زمانہ تھا جس سے آزادی حاصل کرنے میں قوت فیصلہ مہینوں متذبذب رہی۔بچپن سے میری ذہنی صلاحیتیں بیک وقت دو متوازی دھاروں میں بہتی رہی تھیں۔ایک طرف ریاضیات اور سائنس سے شغف اور ان میں غیر معمولی استعداد اور کامیابیاں، دوسری طرف مذہب، شاعری اور مصوری سے جنون کی حد تک دلچسپی، شاعری کا شوق اس وقت سے تھا جب سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا، مصوری کے کچھ امتحانات ہائی اسکول کرنے سے پہلے ہی پاس کر کے اس شوق کو دوسرے شوقوں کی تکمیل کے لیے تج چکا تھا۔مذہب میرے ماحول میں سرایت کیے ہوئے تھا۔پرانا زمانہ ہوتا اور علم میں خصوصی مہارت Specialisation پر زور نہ ہوتا تو شاید یہ سب دلچسپیاں بیک وقت تشفی پاتی رہتیں مگر اب مجھے تعلیمی زندگی کے لیے کسی ایک دھارے کا انتخاب کرنا تھا۔ہائی اسکول میں ریاضی اور اعلیٰ ریاضی میں صد فیصد نمبر ملے تو استادوں، بزرگوں، دوستوں اور والدین نے میڈیسن اور انجینئرنگ کی تعلیم کی خاطر سائنس لینے پر مجبور کیا۔والد کو میرے معاشی مستقبل کی فکر تھی مگر والدہ کو خود میری فکر۔پہلے وہ میری طرفدار تھیں پھر بھی پہلے مقابلے میں فتح سائنس اور ریاضیات کو ہوئی۔انٹر تو میں نے جوں توں کرلیا مگر بی اے کے لیے ادب و فلسفہ کے شوق فضول نے یہ مضامین چھڑا دیے۔بزرگوں کی مستقبل اندیشی ہار گئی اور میرا جنون کامیاب ہوگیا۔ریاضیات کو ادب کے لیے ترک کیا اور ادب کے توسط سے فلسفے تک پہنچا۔زندگی کے اس اہم فیصلے نے مجھے چند مضامین ہی نہیں ایک دنیا سے کاٹ دیا۔خوش حالی کی ضامن وہ دنیا آج بھی کبھی کبھی یادوں کے افق سے ملامت کرتی نظر آتی ہے خصوصاً اس وقت جب اپنے مضامین کی اسناد کو بازار معاش میں کسی بڑھیا کی سوت کی انٹی سے بھی بے وقعت پاتا ہوں۔

دراصل اقبال کے اثر نے مجھے شاعری کے توسط سے فلسفے کے مطالعے کا شوق دلایا۔حیدرآباد میں اقبال کو شاعر ہی نہیں عہد آفریں مفکر بلکہ پیغمبر کی حیثیت حاصل تھی۔شاعری کا آغاز تو میں نے نوحوں، سلاموں اور مرثیوں سے کیا تھا مگر روایتی انداز کی مذہبی شاعری اقبال کے مطالعے کے بعد نظر میں پہلے کی طرح معتبر نہ رہی۔میرے لیے بال جبریل اور ضرب کلیم شعری مجموعے ہی نہیں، شاعری کا آئیڈل بھی تھے۔اقبال نے کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری طور پر مجھے فلسفہ و شعر کو تخلیقی سطح پر ایک کرنا بھی سکھایا۔بعد میں اپنے ادبی ارتقا میں اقبال مجھ سے دور ہوتے گئے مگر ان کا اثر کہیں نہ کہیں ضرور کارفرما رہا ہوگا۔اقبال کے بہت سے فلسفیانہ سیاسی اور مذہبی تصورات کو تو میں نے رد کر دیا، مگر ان کے فن کا منکر ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔

اقبال کے ساتھ ہی دوسرا گہرا اثر مجھ پر انیس کا رہا۔انیس کا اثر مجھ پر عزاداری کے ماحول میں، جہاں ان کا اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے براہ راست بھی پڑا اور بالواسطہ دوسرے شاعروں کے وسیلے سے بھی۔اقبال اور جوش پر انیس کا اثر تلاش کرنا بہت آسان ہے۔چکبست تو انیس ہی کا چربہ ہیں۔لیکن ترقی پسند شعرا میں سے خصوصاً سردار جعفری جن کی شاعری ایک زمانے میں مجھے اپیل کرتی تھی، انیس سے متاثر رہے ہیں۔مجھے اپنے ایک استاد یعقوب عثمانی کا یہ قول آج بھی یاد ہے کہ اگر اردو زبان پر ایمان لانا ہے تو انیس کو پڑھو۔جو لوگ انیس کو ایک مذہبی فرقے کا شاعر سمجھتے ہیں ان کا شعری ذوق اور ادبی دیانت دونوں میری نظر میں مشتبہ ہیں۔بیانیہ شاعری کی جہت میں اردو کی ترقی کا راز آج بھی انیس سے سیکھا جاسکتا ہے۔اگر اقبال نے مجھے شاعری کا تیسرا بُعد (گہرائی اور بلندی) سمجھایا تو انیس نے بیان کی وسعتوں اور زبان کی قدرت سے آشنا کیا۔ترقی پسند شاعروں نے عموماً انیس کا اثر اقبال یا جوش کے توسط سے قبول کیا ہے۔

آغاز سخن میں پانچ اور شاعر مجھے خصوصیت سے عزیز رہے ہیں۔میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، جوشؔ اور سردار جعفری۔سردار کے مجموعہ 'پرواز' پر مجنوں گورکھپوری اور فراق نے دیباچے لکھ کر انہیں اقبال کے بعد سب سے اہم شاعر قرار دیا تھا۔پتہ نہیں آج ان حضرات کا کیا خیال ہے مگر ان آرا نے میرے لیے اس وقت ان کی شاعری کو بہت وقیع بنا دیا تھا۔یہ دوسری بات ہے کہ آج میں پرواز کو اہمیت نہیں دیتا اور اس سردار کا قائل ہوں جو 'پتھر کی دیوار' اور 'نئی دنیا کو سلام' کا شاعر ہے۔ان مجموعوں کی تاریخی اور تجرباتی اہمیت آج بھی باقی ہے۔جوشؔ کا اثر بہت جلد زائل ہوگیا۔میرؔ اور غالبؔ کی روح تک پہنچنے میں برسوں لگ گئے۔دیوان غالب بچپن سے اب تک حرز جاں رہا ہے، اسی طرح کلیات میر کی سیر بھی اب تک نئی نئی دنیاؤں سے روشناس کرتی رہتی ہے۔حالی کا اثر بھی بچپن کے ساتھ ختم ہوگیا مگر مدوجزر اسلام کی سادگی اور اس کی قدیم عشقیہ غزلوں کی نشتریت آج بھی مزا دے جاتی ہے۔یگانہ سے دلچسپی مجھے ان کی شاعری اور شخصیت کی بنا پر بعد میں پیدا ہوئی۔

حیدرآباد کے شاعروں میں مخدوم ہمیشہ ایک داستانی کردار کی طرح مقبول اور اپنے سیاسی کارناموں کے لیے محترم سمجھے جاتے رہے ہیں۔سرخ سویرا سے میں اس وقت متعارف ہوا جب اسکا اثر قبول کرنا ممکن ہی نہ تھا لیکن جب گوشت پوست کے زندہ، حساس، ظریف الطبع، گمبھیر، یار باش، رند مشرب مخدوم سے ملاقات، قرب اور بے تکلفی کا شرف حاصل ہوا تو ہر بار کسی نہ کسی مسئلے

پر شدید اختلاف اور لڑائی کے باوجود ان کی شخصیت کی مقناطیسی کشش نے مجھے اپنا بنانے پر مجبور کیا۔ ان کی آخری عمر کی شاعری ان کے ذہن کی تخلیقی توانائی اور عصر شناسی کی روشن دلیل ہے۔ مخدو م سیاسی لیڈر رہوتے ہوئے اول وآخر شاعروں کے قبیلے ہی کے سرخیل تھے۔ ان کے ساتھ حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا ایک دور ختم ہوگیا۔ اور اس دور کی موت پر میرے دوسرے مگر عزیز ترین دوست سلیمان اریب کی موت نے آخری مہر لگادی۔ اریب میرے لیے شاعر کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان کی دوستی، وضع داری، دلنوازی، محبوبیت، شخصیت کی وسعت، آزاد خیالی، باغیانہ روش، رندی، عالی ظرفی اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی اس وقت سے جب میں پہلے پہل حیدرآباد گیا، زندگی کی آخری سانس تک میری رفیق سفر رہی۔ اریب سے مل کر میں نے یہ بھی جانا کہ انسانیت شاعری پر مقدم ہے۔ یہ شرافت سستی شہرت سے افضل اور خودداری ادب میں خود فروشی سے زیادہ قابل قدر۔ اریب طالب علمی کے زمانے سے میری بے معاشی، شکست عقائد وشکست خواب کے شوریدہ سر دور تک اور پھر حیدرآباد چھوڑ کر علی گڑھ آنے کے بعد بھی میرے سب سے قریبی غم خوار، ہمدرد اور میری کامیابیوں پر سب سے زیادہ خوش ہونے والے دوست رہے ہیں۔ مخدوم اور اریب کے بعد مجھے حیدرآباد اسی طرح خالی خالی لگتا ہے جیسے اورنگ آباد کے دوستوں کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد وہ شہر اجنبی معلوم ہوتا ہے۔

اورنگ آباد کے ادبی حلقے میں کتنے ہی بزرگ اور دوست تھے۔ وقت نے یہ شیرازہ منتشر کردیا مگر میری ذاتی اور ادبی زندگی میں ان سب کی یادیں آج بھی چراغوں کی طرح روشن ہیں کیونکہ اس حلقے میں میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ فرہاد زیدی اور اطہر رضوی نے مجھے ادب کی دنیا سے اور میر حسن، اوصاف علی عباسی اور متین سروش نے ریڈیو سے روشناس کرایا۔ ریڈیو کے لیے میں نے سیکڑوں فیچر، غنائیے، تقریریں اور مختلف النوع پروگرام لکھے اور کم وبیش اتنے ہی ریڈیائی ڈراموں میں صداکاری بھی کی۔ اس تجربے کا نتیجہ یہ نکلا 1958 میں ماسکو ریڈیو کے لیے حکومت ہند کی کمیٹی نے میرا انتخاب کیا۔ لیکن بعض اسباب کی بنا پر میں وہاں نہ جاسکا۔ اسی زمانے میں آل انڈیا ریڈیو میں اردو پروگرام کے پروڈیوسر کی حیثیت سے بھی میرا انتخاب اور تقرر ہوا۔ مگر میں نے یونیورسٹی کی ملازمت کو علمی کاموں کے لیے زیادہ سازگار سمجھ کر ریڈیو کا خیال ترک کردیا۔ اے آئی آر کے لوگوں میں قاضی عیاض انصاری کی شخصیت اور ان کی مہارت فن کا میں برسوں سے گرویدہ رہا ہوں۔

میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک اور سیاست میں بائیں بازو کے رجحانات کا اثر اورنگ آباد کے قیام ہی میں قبول کرنے لگا تھا۔ 1952 میں حیدرآباد پہنچا یہاں مجھے جامعہ عثمانیہ میں پڑھنے اور وسیع تر ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کا شوق کھینچ کر لایا تھا۔ روشنیوں اور رنگینیوں کے اس شہر میں زندگی مجھ سے گریزاں بھی رہی اور مجھے اپنے تعاقب میں برسوں کشاں کشاں لیے بھی پھری۔ انہی حالات میں جامعہ عثمانیہ سے بی اے اور پھر ایم اے (فلسفہ) فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ تصوف کے موضوع پر ڈاکٹر میر ولی الدین کی رہنمائی میں ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھا۔ 1960 میں ڈگری ملی۔ تعلیمی مشاغل سے زیادہ مجھے حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں سے دلچسپی رہی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا دفتر جو بعد میں 'صبا' کا دفتر بن گیا تھا، میرا ہی نہیں بلکہ اس زمانے کے ہر شاعر، ادیب، اور دانشور کا مرجع تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے میرے ادبی ذوق کے ساتھ تنقیدی شعور کی بھی تربیت کی لیکن اس ادبی نقطۂ نظر کی انتہا پسندی اور میکانکیت نے مجھے ترقی پسندی کے محدود تصور اور اس کے ادعائی اطلاق سے اختلاف کرنے پر بھی مجبور کیا۔ 1958 سے 1960 تک میرے وقت کا بڑا حصہ ان ہی بحثوں کی نذر ہوا۔ اس وقت ادب میں اس نظریے کی انتہا پسندی کے خلاف جہاد بڑا مشکل کام تھا۔ دوستوں اور بعض رفیقوں کی مخالفت بلکہ دشمنی تک مول لینی پڑی۔ یہی زمانہ میرے لیے آدرشوں کی شکست اور رومانی وابستگیوں کے ٹوٹنے کا بھی زمانہ تھا جن خوابوں کے سہارے طالب علمی کی صبر آزما زندگی کی صعوبتیں رجائیت کے ساتھ جھیلی تھیں۔ عمل کی دنیا میں وہ سارے خواب، تعصّبات، سفارشات، بے اصولیوں کے سنگین پتھروں سے ٹکرا کر لہولہا ن ہوگئے۔ بکھر گئے۔ تب یہ عقدہ کھلا کہ جو لوگ آدرشوں اور خوابوں کا زبان سے ورد کرتے ہیں عمل میں وہی ان کے سب سے بڑے قاتل بھی ہیں۔ اس اجمالی کی تفصیل اس جگہ بے محل ہوگی جب عثمانیہ کے دروازے بند ہوگئے تو علی گڑھ کا رخ کرنا پڑا۔ اس واقعہ کی تلخی تو آہستہ آہستہ دل سے محو ہوگئی مگر اس تجربے نے میرے تصور زندگی کو یکسر بدل ڈالا۔ اب پتہ چلا کہ جو کچھ سوچا تھا وہ خواب تھا یا خواب پرستی۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا اب ہوا ہے۔ شادی کے بعد ایک بار پھر میری زندگی اس سکون، اپنائیت اور محبت سے روشناس ہوئی جس سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ میری بیوی نے میری زندگی میں وہ ضبط وتوازن پیدا کیا، جو برسوں سے ناپید تھا۔ متاہلی زندگی نے میرے مزاج میں ٹھہراؤ اور اعتدال پیدا کرنے میں تھوڑی ہی سہی مگر ضرور کی۔ میرے بیٹوں حسن، حسین اور محسن نے زندگی پر ایمان کے ساتھ کچھ دن زندہ رہنے اور کچھ کرنے کا شوق بھی پھر سے دل میں تازہ کیا۔ زندگی سے لڑائی تو اب بھی ہے مگر گھر نے سکون کا ایک گوشہ ضرور فراہم کردیا ہے۔

آزمائشوں کے ہر دور میں مطالعہ ہی میرے لیے تسکین دل ودماغ کا واحد وسیلہ رہا ہے۔ کتابوں کے توسط سے جن شخصیتوں اور دماغوں نے میری حوصلہ افزائی کی زندگی کے راز منکشف ہوئے، جینا سکھایا اور جینے کی دشواریوں میں اعلیٰ اقدار وتصورات کو ہر حال میں عزیز رکھنا سکھایا، ان کی فہرست طویل ہے۔ اگر میں اپنے محبوب مفکرین مصنفین کی فہرست بناؤں تو چند نام سرفہرست ہوں گے۔ دوستوسکی، والٹیر، روسو، ٹالسٹائی، سوفٹ، شیلی، کیٹس، گوئٹے، افلاطون، ابن رشد، مارکس اینگلز، لینن، برٹرینڈ رسل، کامو، سارتر، سعدی، حافظ، فرائیڈ اور نطشے چند نام ہیں جنہوں نے مختلف زبانوں میں میری شخصیت کی تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ جو تاریخی شخصیتیں میرے وجود کی تکمیل میں معاون ہوئیں۔ ان میں ابتدائی خاندان ماحول کے توسط سے، رسول اسلام، حضرت علی، امام حسین کو اولیت حاصل ہے۔ سقراط، عیسیٰ، گوتم بدھ اور مارکس کا اثر اس کے بعد آتا ہے۔ لیکن میں محدود مذہبی وابستگی کے بجائے اسلامی شخصیتوں کے اثر کو بھی وسیع تر انسانی کارناموں ہی کا ایک جزو سمجھتا ہوں۔ خشک علمی مطالعے سے ہٹ کر میں نے فکشن کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے، کیونکہ اس مطالعے میں وہ دلچسپی اور لذت بھی ملتی ہے جو فلسفہ ومذہب کی کتابوں میں نہیں ملتی۔ داستانوں سے لے کر شرر کے ناولوں اور تیرتھ رام کے ترجموں تک اور پریم چند سے آج تک کے ہر قابل ذکر اور ناقابل ذکر ناول نویس اور افسانہ نگار کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ اس لیے بھی کیا ہے کہ ہماری خشک بے رنگ زندگی میں یہی ایک ایسی تفریح ہے جو کبھی کبھی مسرت کے ساتھ بصیرت بھی عطا کرتی ہے۔ روسی، فرانسیسی، جرمن اور انگریزی ناولوں اور افسانوں کے مطالعے کو اردو پر پہلے ترجیح دینی پڑی کہ یہاں وہ سب کچھ ملتا ہے جس سے آج تک ہماری زبان کا دامن تہی ہے۔ اردو کے نثر نگاروں میں نیاز فتح پوری کی مذہبی تحریروں نے مجھے عقلیت پسندی سے آشنا کیا۔ بعد میں فلسفۂ کلام، تصوف اور خصوصاً معتزلہ کے مطالعے نے نظر کو وسعت سے آشنا کیا۔ محمد حسین آزاد میرے سب سے محبوب صاحب طرز نگار رہے ہیں لیکن میں ان کے اسلوب کو تنقید کے لیے موزوں نہیں سمجھتا۔ ابتدا میں مرے تنقیدی شعور کو مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور آل احمد سرور کے مضامین کے مطالعے نے جلا بخشی۔ ایک زمانے تک مارکسی نظریۂ ادب وتنقید کا مجھ پر گہرا اثر رہا، اس سلسلے میں خود مارکس اور اینگلز کی تحریریں مارکسی ناقدین کے مقابلے میں زیادہ اثر انداز ہوئیں اس لیے کہ ان میں رجائیت اور مکاتیب کی جگہ وسعت نظر، لچک اور ادبی قدروں سے آگاہی بعد کی مارکسی تنقید سے زیادہ ملتی ہے۔ لینن ایک انقلابی مفکر اور انقلاب روس کے بانی کی حیثیت سے میرے لیے محترم رہے ہیں، مگر ادب پر لینن کی رائیں مجھے یک طرفہ معلوم ہوتی ہیں۔ ہم عصر فلسفوں میں وجودیت، خصوصاً ہائیڈیگر، یاسپرس اور سارتر کی کتابوں نے میری فکر کو یک رخے پن سے آزاد کرنے اور جدید دور کی حسیت اور طرز فکر کو سمجھنے میں میری مدد کی۔ وجودیت کو میں کوئی منضبط یا مستقل فلسفہ نہیں مانتا بلکہ اسے ہم عصر زندگی کی پیچیدگیوں اور مسائل کو سمجھنے کے لیے ایک ایسا رویہ مانتا ہوں جو مارکسی فکر کی اجتماعیت اور سماجی، مادی عوام پر اصرار کو انفرادی تجربۂ وجود سے آشنا کرکے، اس کے تکملے کا

کام کرسکتا ہے۔ شاید ان دو فلسفوں کی مناسب آمیزش سے ہی وہ فلسفہ بن سکتا ہے جو ہم عصر سماج اور ادب کی آگہی بھی عطا کرسکتا ہے اور اس کی تشکیل نو میں بھی معاون ہوسکتا ہے۔ ہمارے ملک اور تہذیب کے مزاج اور ہمعصر تقاضوں کو شاید کوئی مغربی فلسفہ جوں کا توں راس بھی نہیں آسکتا۔ اس میں ضروری ترمیم و تنسیخ بڑی حد تک لازمی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے مطالعے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ہمارے ذہن و نظر کو ایک حد تک قدیم مذہبی تصورات و تعصّبات سے آزاد کرنے کے لیے سائنسی طرز فکر و تحقیق کی بھی شدید ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں سائنس کی تعلیم تو عام ہے مگر خود سائنسدانوں اور سائنس کے اساتذہ و طلبہ میں بھی وہ سائنسی رویہ کمیاب ہے، جو حقیقت کی بے تعصب تحقیق و تلاش اور معاصر زندگی کی تشکیل نو کے سائنسی طرز عمل سے عبارت ہے۔ اس جہت میں فلسفے کا وہ مکتب خیال جو سائنسی انداز میں حقیقت کے مسائل، حتیٰ کے مابعد الطبیعات کو بھی حل کرنا چاہتا ہے، ہماری مدد بھی کرسکتا ہے۔ میں فلسفے کی منطقی اور لسانیاتی تجزیے کے مکتب خیال کو اس ضرورت کی بنا پر آج کی تعلیم میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ مذہب کی عطا کی ہوئی اعلیٰ قدروں کے عمل میں احترام ضروری ہے مگر مذہب کی حقیقت کو سمجھنے اور بدلنے کے عمل میں رکاوٹ نہ بننا چاہئے۔ ہمارے نظام تعلیم پر مذہب یا مصنوعی مذہبی طرز فکر کا جو تسلط ہے اس سے آزادی اور سائنسی رویے سے آشنائی وقت کی بنیادی ضرورت ہے۔ اسی کمی کی وجہ سے پچھلے کئی سو سال میں ہمارے ملک نے کوئی ایسا فلسفی پیدا نہیں کیا جو اسی طرح ہماری تہذیب اور اس کے ہمعصر مزاج کی ترجمانی کرسکتا جس طرح مغرب کی ترجمانی اس کے ہم عصر فلسفی کررہے ہیں۔ میرے لیے مذہب ادب تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ اسی تلاش سے عبارت رہا ہے جو حقیقت کو بے نقاب کرسکے اور اپنے خوابوں کے مطابق اسے بدلنے اور ڈھالنے میں ہمیں زندگی کا عرفان عطا کرکے ہماری مدد کرسکے۔

مطالعے کی پیاس نے مجھے ہمیشہ بے چین رکھا ہے۔ مگر بڑی حد تک جس فراغت مادی، آسائش اور ذہنی سکون کا متقاضی ہے وہ میرے لیے آغاز طلب علم میں نایاب رہا۔ آج تک بھی بقدر شوق میسر نہیں۔ یہ ایسی تشنگی ہے جو ہر جرعے کے ساتھ بڑھتی اور ہر جام کے ساتھ ھل من مزید کا نعرہ لگاتی ہے اس لیے ان لوگوں پر ہمیشہ رشک آتا رہا ہے جنہیں زندگی نے علم کے سمندر سے حوصلے کے مطابق پیاس بجھانے کے مواقع دیے ہیں۔ میں اپنے فلسفے کے استادوں میں ڈاکٹر میر ولی الدین سے نظریاتی اختلاف کے باوجود ان کی انتھک محنت اور صلاح الدین صاحب (سجاد ظہیر کی لندن کی ایک رات کے ہیرو) اور ڈاکٹر وحید الدین کے وسیع مطالعے کی وجہ سے اس کی طرف کھنچا ہوں۔ حیدر آباد کے دوستوں میں عالم خوندمیری کی وسعت مطالعہ کے ساتھ ان کی جودت طبع اور ادراکی نے مجھے اس سے قریب کیا ہے تو علی گڑھ کے بزرگوں میں مجنوں صاحب کے مطالعے کی ہمہ جہتی اور وسعت پر رشک آیا ہے اور اس عمر میں بھی سرور صاحب کا جدید سے جدید ادبی اور فکری کارنامے سے آگہی حاصل کرنے کا شوق مجھے بھی اپنے مطالعے کی بے بضاعتی دور کرنیکی تحریک دیتا رہا ہے۔ خورشید الاسلام کی ذہانت، طباعی، شائستہ انانیت اور موجودہ معاشرتی اور علمی نظام کے خلاف ان کے غم و غصہ میں بھی مجھے کبھی کبھی بے چین شخصیت کی جھلک دکھائی دی ہے جو میرے اندر چھپی ہوئی کئی شخصیتوں میں کچھ کا آئینہ بن جاتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی اردو ادب کے قدیم سے لے کر جدید تک ہر دور سے گہری واقفیت بھی جو کبھی کبھی حوالوں کی کتاب نعم البدل بن جاتی ہے۔ میری تشنگی مطالعہ کو دعوت مبارزت دیتی رہتی ہے۔ کتابوں سے زیادہ سے زیادہ آشنائی کا ذوق کتب خانوں اور کتابوں کی دکانوں کو میرے دیدۂ حیراں کے لیے ایسا تصویر خانہ بنا دیتا ہے جس کی تصویر مجھے اپنی طرف بلاتی ہے مگر حوصلے کی پستی شوق کی اس بلندی کو کبھی وقت کی تنگ دامانی کی زنجیر پہنا دیتی ہے اور کبھی تہی جیب ہونے کا احساس غم آروز کو تیز کرنے والا طوق گلو بن جاتا ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اپنے آپ کو کتابوں کی دنیا میں اس طرح گم کردیتے ہیں کہ زندگی کی طوفانی لہریں بھی ان میں اس جزیرے سے باہر نکلنے پر مجبور نہیں کرتیں۔ ایک طرف تو زندگی کے طوفان اور دوسری طرف خود اپنے اندر اٹھنے والی وہ طوفانی لہریں جو قلم کے سہارے کاغذ پر مچلنے اور تڑپنے کو بے تاب رہتی ہیں، مجھے نشاط مطالعہ کے جزیرے سے بار بار باہر کھینچ لاتی ہیں۔ اپنے محسوسات اور افکار کو لفظوں کی قبا پہنا کر پیش کرنے کا بے محابا شوق شاید اس وقت سے میرے ساتھ لگا ہے جب سے میں نے لفظ اور معنی قلم اور تجربے زبان اور احساس کے رشتے کو سمجھنا سیکھا ہے۔ اظہارِ ذات کی یہ ناقابل بیان بے تابی مطالعے میں خارج بھی ہوتی ہے اور اسے ایک دھارے سے دوسرے دھارے پر بھی بہا لے جاتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ طویل تعطیلات میں کتابوں کا پشتارہ اٹھائے گوشۂ فراغت میں پہنچا مگر طبیعت کی بے چینی اور تلون نے ایک کتاب کا بھی ورق الٹنے نہیں دیا اور یہ بھی ہوا ہے کہ بلا وجہ شاید تساہلی خود کو کتابوں میں گم کردینے ہی کو عافیت سمجھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کبھی تو میں طویل مضمون یا نظم ایک دو دن میں مکمل کرلیتا ہوں اور کبھی دو چار صفحات لکھنے کے کام کو بھی مہینوں ٹالتا رہتا ہوں۔ ذہنی کاہلی کا زمانہ میرے لیے ناولوں کے مطالعے کا زمانہ ہوتا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ کیفیت جسے عام لوگ کاہلی سمجھتے ہیں بے انتہا داخلی کشمکش اور ذہنی فعالیت کا دور ہوتا ہے جو کبھی جلد اور کبھی دیر میں کسی تخلیق میں اپنے آپ کو ظاہر کردیتی ہے۔

لکھنے اور پڑھنے کی یہ دوگونہ مصروفیت دراصل ایک دوسرے کا لازمہ بھی ہے اور تکملہ بھی۔ مجھے بہت سی سماجی اور سیاسی تحریکیں اکثر عمل کی طرف بلاتی ہیں مگر شاعری اور مطالعے نے مل کر مزاج کی کچھ اس طور پر تشکیل کی ہے کہ عمل سے گریز کے لیے یہ جواز ڈھونڈ لیتا ہوں کہ وہ ذہنی فعالیت جو پڑھنے اور لکھنے سے عبارت ہے۔ بہت سی ہنگامی تحریکوں کی دعوتِ عمل سے زیادہ دور رس اور دیرپا عمل کا نعم البدل بن سکتی ہے۔ یہ بھی شاید دانشوروں کا ایک حیلہ ہے جو انہوں نے خود کو معاصر زندگی کے عملی کاموں سے آزاد رکھنے کے لیے تراش لیا ہے مگر اس خود تراشیدہ حیلے نے مجھے وہ گوشۂ عافیت فراہم کیا ہے جہاں چھپ کر زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے، وقت کے عمل کو پڑھنے اور ہمعصر زندگی کے تقاضوں کو قلم بند کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک شاعر یا ادیب کی زندگی کا محور کتاب ہی ہے، چاہے وہ پڑھی جائے یا لکھی جائے۔ ہر انسان ہی نہیں بلکہ شجر و حجر کو بھی کتاب آشنا کرنے کی ضد ہی ہماری زندگی کی سب سے بڑی محرومی بھی ہے اور مسرت بھی:

ہمیں یہ ضد ہے کہ پتھر پہ بھی کتاب اترے
بہت سے لوگ ورق دل کا سادہ رکھتے ہیں

کاغذی کتابوں کے ذکر سے ہٹ کر اگر میں ان زندہ کتابوں کا ذکر کرنے بیٹھوں جو زندگی کے مختلف ادوار میں مجھ پر نازل اور منکشف ہوتی رہی ہیں تو یہ تفصیل دفتروں کی طلب گار ہوگی لہٰذا میں اپنے بہت سے دوستوں کا ذکر جو میری شخصیت کی تشکیل میں مختلف مثبت اور منفی طریقوں سے میری زندگی پر انداز ہوتے رہے ہیں کسی ایسے موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں جب مکمل خودنوشت لکھنے کی نوبت آئے گی۔ ذکر یاراں میں یہ اندیشہ بھی مانع ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مختصر گنجائش میں ایسے نام چھوٹ جائیں جن کا ذکر میری زندگی پر قرض ہے اور انہیں شکایت ہو۔

غبار عمر رفتہ کو سمیٹنے کی کوشش شاید ابھی تشنہ تکمیل رہے اس لیے کہ اگر وقت عمر طبعی تک پہنچنے کی مہلت دیتا ہے تو میری زندگی کی کتاب کچھ تو وقت کے ہاتھوں مکمل ہوتی رہے گی اور کچھ خود اپنے قلم کی کاوش سے تکمیل پائے گی۔ اس ادھوری کتاب پر خاتمے کی مہر لگانے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے اور اگر جلد ہی خاتمے کی مہر لگنی بھی ہے تو یہ کام خود کرنے کے بجائے عمر گریزاں کے لیے چھوڑ دینا ہی بہتر ہوگا۔ ہر زندگی کو جلد یا بدیر غبار کارواں میں خود بھی گم ہونا ہے مگر ذہن و دل کی زندگی تک خود کو وقت کے کارواں میں شریک رکھنے کی خواہش ہی کا دوسرا نام زندگی بھی ہے۔

ایڈیٹر	شہباز حسین
سب ایڈیٹر	نند کشور وکرم

ماہنامہ 'آجکل' (جنوری 1972)

اردو ادب کا وکیل: آنند لہر

آنند لہر سے میری آخری ملاقات غالباً 25 جنوری 2014 کو ان کے ہی شہر جموں میں ہوئی تھی۔ اپنے ٹرانسفر پر ریڈیو کشمیر میں کارسپونڈنٹ کی حیثیت سے جوائن کرنے کے لیے ہم جموں پہنچے تھے۔ سروس جوائن کرنے کے بعد ہم جموں یونیورسٹی میں علم سیاسیات کے پروفیسر تاج الدین سے ملنے پہنچے اور ان کے اصرار پر ہم ان کی رہائش گاہ پر کرایہ کا مکان ملنے تک ٹھہرے ہوئے تھے۔

آنند لہر (شیام سندر) کو جوں ہی معلوم ہوا کہ ہم آئے ہوئے ہیں تو وہ فوراً جموں یونیورسٹی میں آدھمکے۔ آنند لہر سے مل کر ہمیں جس قدر خوشی ہوئی تھی اس سے کہیں زیادہ وہ خوش نظر آتے تھے۔ جاتے جاتے آنند لہر نے ہمیں دوسرے دن پریس کلب میں لنچ پر مدعو کیا۔ آنند لہر کے اس خلوص ومحبت اور بے تکلف رویے سے مجھ سے زیادہ میری اہلیہ راحت جبیں اور میرے دوست عبدالمنان متاثر نظر آئے۔ لیکن وہ دن ہے اور آج کا دن ہم ان سے پھر نہیں مل سکے۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ آنند لہر سخت بیمار ہیں اور جموں کے کسی بڑے اسپتال کے آئی سی یو میں داخل کیے گئے ہیں اور پھر معلوم ہوا کہ اب وہ کوما میں ہیں۔ آج 7 دسمبر کو ان کے انتقال کی خبر سن کر میں بہت دکھی ہوا۔

اس چار سال کے عرصے میں میرا جموں سے دہلی تبادلہ ہوگیا اور میں دہلی پہنچ کر وزارت دفاع کے 13 زبانوں میں نکلنے والا رسالہ پندرہ روزہ 'سینک سماچار' جوائن کرلیا اور کچھ ہی دنوں بعد ماہنامہ 'آجکل' میں پھر آ گیا۔

ہمارے دفتر میں یوں تو بہت سے شاعر وادیب آتے رہتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت کم ہی ہوتے ہیں جو ہم سے بے غرض ملنے آتے ہوں۔ آنند لہر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ جب بھی دہلی آتے، ہم سے ملنے ہمارے دفتر 'آجکل' ضرور آتے اور جب بھی آتے کچھ نہ کچھ تحفتاً ہمارے لیے ضرور لاتے اور عام طور پر کسی اچھی کمپنی کا ڈبہ بند بسکٹ ضرور لاتے تھے۔ مٹھائی کو نہ وہ پسند کرتے تھے اور نہ ہی مٹھائی بطور تحفہ کسی کو دینا پسند کرتے تھے۔ ہم نے ایک بار اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ برائے کرم ہمیشہ یہ تحفہ نہ لایا کریں۔ اتفاقاً اسی وقت چائے آ گئی اور چائے کے ساتھ وائے یعنی بسکٹ بھی۔ آنند لہر نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے برجستہ کہا کہ آپ ہمیشہ چائے وائے کیوں پیش کرتے ہیں؟ در پردہ آنند لہر کی اس سرزنش کے سامنے ہم نے سپر ڈال دی۔ آنند لہر پیشہ سے ایڈوکیٹ تھے اور ان کا ایک پیر جموں میں ہوتا تھا تو دوسرا دہلی سپریم کورٹ میں۔ وہ دہلی جب بھی آتے ہم سے ملنے دفتر 'آجکل' ضرور آتے۔

وکالت کا پیشہ گرچہ بہت اہم اور جوکھم بھرا ہے، باوجود اس کے انہوں نے ادب بطور خاص فکشن سے خود کو کچھ اس طرح جوڑے رکھا تھا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ آنند لہر پہلے ادیب ہیں یا وکیل۔ اگرچہ وہ نامی ڈوگری سنستھا کے صدر تھے اور جموں میں ڈوگری بولتے تھے لیکن اردو سے انہیں خاص لگاؤ رہا اور انجمن ترقی اردو کے تعاون سے اردو کے فروغ کے لیے کام کرتے تھے۔ آنند لہر نے اردو فکشن کے تقریباً تمام اصناف ناول، افسانے اور ڈرامے پر طبع آزمائی کی اور حتی الامکان ان اصناف سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ آنند لہر اپنے پیشۂ وکالت کو زیادہ وقت دیتے تھے یا اپنے شوق ادب کو۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان توازن کے قائل تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وکالت سے وہ کماتے تھے اور شوق ادب پر لٹاتے تھے۔

آنند لہر نے کوشش کی ہے کہ وہ اپنے آس پاس کے تمام مسائل پر اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں گیسوئے ادب کو سنوارتے رہے۔ سرحد اور کشمیر ان کی نگارشات / تخلیقات کا مرکزی موضوع تھا جس پر انہوں نے تواتر سے لکھا ہے اس پر کس حد تک کامیاب ہوئے کہنا مشکل ہے کہ اردو ناقدین نے اب تک ان سے بے التفاتی برتی ہے۔ آنند لہر کی کتابوں میں سرحدوں کے بیچ (ناول) نروان، تپسوی کون (ڈرامے) اور سرحد کے اس پار (ناول) اور انحراف (افسانہ) اگلی عید سے پہلے خاص ہیں۔

سرحدوں کے بیچ آنند لہر کا ایک اہم ناول ہے۔ یہاں مختصر طور پر اس کا تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سرحد کے پار ایک گاؤں ہے جو کبھی ایک عام گاؤں تھا۔ لیکن اب تقسیم کے بعد وہ ملک کا آخری گاؤں ہے۔ وہاں کے سیدھے سادے لوگوں کو نہ تو اس تقسیم کے مضمرات کا پتا ہے اور نہ ہی وہ کسی سرحد کو سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ رام غلام کی بیٹی رانی اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے حسب معمول پودینہ لینے سرحد کے اس پار غلطی سے چلی جاتی ہے تاکہ اس سے چٹنی بنا کر اپنا روکھا سوکھا کھانا کھا کر گزارہ کرسکے۔ وہاں سرحد پر اسے پکڑ لیا جاتا ہے اور اس پر جاسوسی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اسے حوالات اور پھر جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔

حوالات میں پوچھ گچھ کے دوران اس پر ظلم وزیادتی ہوتی ہے۔ ایسے میں ایک نیا پولیس افسر راجا ایک سہارا بن کر سامنے آتا ہے اور پھر شروع ہوتا ہے عشق کا چکر۔ نتیجہ میں جیل میں ہی رانی کو ایک بچہ ہوتا ہے۔ رانی اب بہت حد تک حوالات اور جیل کے ماحول سے مانوس ہوچکی ہوتی ہے کہ ایک لمبے عرصے کے بعد اس پر کوئی جرم ثابت نہ ہونے کی بنا پر اس کی رہائی کا حکم ہوتا ہے۔ رانی کی رہائی ہوتی ہے لیکن اس وقت رانی اور راجا کے سینے چور چور ہوجاتے ہیں جب رانی کو رہائی کے فوراً بعد سرحد کے اس پار چھوڑ دیا جاتا ہے اور راجا اس پار حیرت اور حسرت سے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ناول کا آخری سین بہت نفسیاتی اور جذباتی ہے اور اسے پڑھ کر قاری ایک لمحہ کے لیے دم بخود رہ جاتا ہے:

''سب دیکھ رہے ہیں کہ سرحد کے ایک طرف رانی کھڑی ہے اور دوسری طرف راجا اور دونوں اپنے اپنے ملک کی سرحد میں کھڑے ہیں اور درمیان میں ایک بچہ کھڑا ہے، جس کا کوئی ملک نہیں۔'' کہانی یہاں ختم ہوجاتی ہے اور چھوڑ جاتی ہے اپنے پیچھے کئی سوالات۔ قاری کچھ دیر تک انہی سوالات کے ادھیڑبن میں الجھا رہتا ہے۔ یہ اس ناول کی کامیابی کی دلیل ہے۔ 'سرحد کے اس پار' نام کے افسانوی مجموعہ میں اسی موضوع پر تکرار کی حد تک اظہار خیال کیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ لفظ سرحد آنند لہر کے یہاں اسم اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل آنند لہر کا تعلق ایسے علاقے سے ہے جو ہند پاک سرحد کے قریب واقع ہے اور سرحد پر آئے دن پیش آنے والے واقعات، سانحات اور حادثات ان کی نظر کے سامنے رہتے ہیں۔ جب جب اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں تو ان کا نرم دل انسانیت کی بے حرمتی پر بلک اٹھتا ہے۔ ان کا حساس قلم اس طرح کے واقعات کو رقم کرتا چلا جاتا ہے اور حرف آخر کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آنند لہر کی شخصیت کا ایڈوکیٹ ان کی شخصیت کے ادیب پر کسی حد تک بھاری ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اردو کے سچے عاشق اور وکیل تھے۔

ابرار رحمانی

آجکل کی فائل سے:

وحید اختر

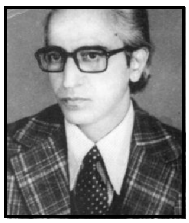

غبارِ کارواں

عہد استپنک کے شہر تمدن کا اک بنجارا
دوش پر اسناد اور کتب خانوں کا بھاری پشتارا
گھر کے بندھن ایسے ٹوٹے زنجیریں بھی ساتھ نہیں
اگلے زمانے کے لوگوں کی تقدیریں بھی ساتھ نہیں
علم کی جوت تعصب کے محرابوں میں دم توڑ گئی
اور یقیں کہ مشعل ایک بھیانک موڑ پہ چھوڑ گئی
فطرت نے بن باس دیا پر پیار دیا نہ رفاقت دی
جس کا گاہک کوئی نہیں ہے دل کی ایسی دولت دی

(بن باس، پتھروں کا مغنی، صفحہ۔100-99)

ہم کو ماضی سے ورثے میں کہنہ قبریں، گرتے ملبے اور آسیب زدہ کھنڈروں کے ڈھیر ملے ہیں۔ (کھنڈر، آسیب اور پھول، پتھروں کا مغنی، صفحہ 83)

نصیر آباد: جائس سے ملحق اودھ یوپی کا ایک قصبہ، جو خاندان اجتہاد کا وطن ہے.....

''بچپن میں گزارے ہوئے چند مہینوں کی یاد میں لیے جب بیس بائیس برس بعد کچھ دنوں کے لیے اپنے ماضی کے اس مزار پر پہنچا تو شرفا کا وہ طبقہ جو چھوٹی موٹی زمینداری کے سہارے، اپنے پرکھوں کی آبرو کو سوجتن سے سنبھالے، تنگدستی میں اور آہستہ آہستہ چھنتی ہوئی خوش حالی میں ذہنی طور پر آسودہ حال تھا، کہیں نظر نہ آیا۔ کچھ پریشان روحیں چیختے ڈھانچوں کی زنجیر میں لپٹی، اپنے شکستہ مزاروں کی گرد میں اٹی ہوئی دکھائی دیں۔ تنگ اور ویران گلیاں ملیں جہاں دن کو بھی لوگ یوں چلتے ہیں جیسے خوابوں کے بھیانک ویرانے سے ڈرتے ڈرتے گزر رہے ہوں۔ بوسیدہ مکانوں کی سوگوار قطاریں، جھکے ہوئے دروازے، شکستہ کھڑکیاں، ماضی کے بوجھ سے چٹختی ہوئی چھتیں، حال کی بدحالی کی پردہ دار دیواریں مجھ سے ملنے آئیں۔ یہاں لوگ اب بھی بزرگوں کی ہڈیوں، شجروں کے کرم خوردہ دفتروں اور سادات کی لٹی ہوئی عزتوں کے مجاور بنے ہیں۔ ان میں نئی دنیا سے آگاہی ہے نہ آگاہی حاصل کرنے کی تشنگی۔ یہ میرا وطن نہیں، ان کا وطن ہے جو اپنی دنیا کی آسودہ حالی، فراغت، سکون اور قدریں اپنے ساتھ لیے جا چکے۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ یہاں زندگی بھی موت کے پروردہ ہے اور بیداری بھی نیند کی ہمزاد میں اس فضا سے دامن چھڑاتا ہوں مگر یہ پھر بھی میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ یہ ہر جگہ میرا پیچھا کرتی ہے۔ اس نے ملک کی وسعتوں تک اپنی جڑیں پھیلا رکھی ہیں۔ یہ ہمارا ماضی ہے جو حال کی گردن پر سوار ہے۔''

(پیش لفظ۔ پتھروں کا مغنی، صفحہ 8)

یہی وہ دنیائیں ہیں جنہیں میں نے ہوش سنبھالنے کے ساتھ دیکھا اور برتا۔ ایک وہ دنیا ہے جسے بے یقینی، بے زمینی، ناوابستگی و جلاوطنی میں اپنی آگ کی جستجو کا نام دے لیجئے۔ ایک وہ دنیا ہے جس میں نہ حال کی ضمانت ہے نہ مستقبل کی امید، ایک دنیا وہ ہے جو مٹ رہی ہے یا مٹ چکی ہے۔ مگر ہمارے وجود میں ان تینوں دنیاؤں کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان دنیاؤں کے کھنڈروں اور ملبوں پر ایک شاعر کو اپنے خوابوں کی دنیا تعمیر کرنی ہے۔ ادب و شعر حال کی شکست و تعمیر، ماضی کی کہنگی اور توانائی اور مستقبل کے موہوم امکانات کی جستجو کا وہ جدلیاتی عمل ہے جس میں روایت کا تسلسل بھی ملتا ہے، انقطاع بھی، انحراف بھی۔ یہ عمل پرانے معانی کی توسیع ہے اور نئے معانی کی تلاش۔ اس عمل کی تب و تاب اپنی ہی آگ کی جستجو سے ملتی ہے۔ گوتم بدھ کے الفاظ میں ہر فرد کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنی نجات کے لیے خود ہی روشنی بن جائے۔ یہ راہبر روشنی اپنے عہد کے چراغوں سے بھی اخذِ نور کرتی ہے اور ماضی کے آفتابوں سے بھی اکتساب ضیا کرتی ہے۔ اگر اس روشنی میں دوسروں کو اپنے نروان کا راستہ بھی سجھائی دے تو بھی ادب و فن کی کامرانی ہے۔

وقت کے لامتناہی اور اٹوٹ تسلسل میں قوموں کی زندگیاں تنکوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں تو ایک فرد کی زندگی کیا؟ ایک موہوم اور معدوم سا نقطہ۔ مگر یہی نقطہ کبھی پھیل کر صدیوں کی وسعت کا احاطہ کر لیتا ہے اور کبھی ازل ابد کی حدوں سے مل جاتا ہے۔ اس وسعت کا انحصار اس پر ہے کہ فرد نے اپنے زمانے اور ماحول کے ساتھ وقت کے تخلیقی تسلسل کو کس حد تک اپنے وجود میں جذب کیا ہے۔ میں جب اپنی آگ کی جستجو کرتا ہوں تو غبارِ کارواں کے طوفانوں میں جگہ جگہ روشنی کے وہ بلند مینار دکھائی دیتے ہیں جن سے میں نے روشنی بھی حاصل کی اور اپنے وجود کی آگ کو روشن رکھنا بھی سیکھا۔

عمر گریزاں کے ان موڑوں اور نشیب و فراز کی طرف آج پلٹ کر دیکھتا ہوں جنہوں نے میری زندگی، شخصیت اور شاعری کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیا ہے تو کتنے ہی افراد کے قرض کے بوجھ سے سر جھک جاتا ہے۔ انہی قرضوں نے مجھے زندگی کے سامنے اتنا سر بلند اور سرخ رو رکھا کہ آج اپنی عمر گزشتہ کا حساب کرتے ہوئے زندگی سے آنکھیں ملا کر اور سر اٹھا کر بات کر سکتا ہوں۔

سب سے پہلا قرض تو والدین کے احسانات کا ہے جو آج اسی خاک کے دامن میں ہمیشہ کے لیے سو رہے ہیں۔ جس خاک سے میری تعمیر ہوئی ہے، میرے والد سید نذر عباس، نصیر آباد (جائس) کے اس خاندان کے فرد تھے جس نے ہندوستان کو اجتہاد کی روشنی سے صدیوں معمور رکھا۔ ملازمت کے سلسلے میں اورنگ آباد دکن میں مقیم رہے۔ میری پیدائش سے قبل وہ تعلیمات اور پولیس کی ملازمتیں کر کے انہیں ترک کر چکے تھے اور اب عدالت میں ناظر تھے۔ میں نے اورنگ آباد کے ایک محلے میں 12 اگست 1935 کو آنکھیں کھولیں۔ زندگی کے ابتدائی چند برسوں کی فراغت والد کی آنکھوں کی روشنی کے ساتھ غائب ہوگئی۔ پرائمری اسکول کے زمانے سے ہی زندگی کی سختیوں، دشواریوں اور جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کی آزمائشوں سے گزرنا سیکھنا پڑا۔ میرے پانچ بھائی اور تھے اور ایک بہن۔ آٹھ افراد کا یہ کنبہ جو پنشن کی معمولی سی رقم میں گزارا کرتے ہوئے بھی نہ جانے کس طرح خاندانی 'میاں پن' کو باقی رکھتے تھے۔ 1952 کے آس پاس تھوڑے سے وقفے میں والدین کی موت کے بعد ایسا برہم ہوا کہ پھر اس کی شیرازہ بندی نہ ہو سکی۔ والدہ جنہوں نے زندگی کی سختیوں کو اپنے بچوں کو پالنے کی لگن میں نہ جانے کس کس طرح سہا تھا، آخر اس بوجھ کی تاب نہ لا کر بیمار پڑیں، جس دن میں نے حیدرآباد کے سفر کے لیے اورنگ آباد چھوڑا اسی دن میری روانگی کے چند گھنٹوں بعد ان کا تارِ نفس بھی ٹوٹ گیا۔ میں حیدرآباد پہنچا تو ان کی موت کی خبر پہلے سے وہاں استقبال کرنے کو پہنچ چکی تھی۔ وہ ماں جس کی شخصیت کا گہرا اثر میری زندگی کے ابتدائی برسوں پر رہا، اس کی سلیقہ مندی تو شاید مجھے نہیں ملی مگر اس کا گہرا انسانی خلوص، دردمندی اور دل سوزی اب تک میری رگوں میں خون بن کر رواں ہے۔

اس دور میں غیروں کی ہمت افزائی، خلوص اور شرافت کا بھی تجربہ ہوا اور اپنوں کی اجنبیت، بے مروتی اور خود غرضی کا نقشہ بھی دیکھا۔ علم کا شوق بچپن سے تھا۔ اسکول کی ہر کلاس میں ہر مضمون میں اول آتا تھا۔ یہی ذہانت میرے لیے واحد زادِ سفر تھی جس کے سہارے بچپن سے، جو خود اپنے پڑھنے کا زمانہ ہوا ہے، ٹیوشن، ریڈیو کے پروگراموں کی شرکت اور ذاکری کے مواقع ملتے رہے۔ میرے لیے یہ شوق محض اظہار ذات کا وسیلہ نہ تھے بلکہ زندگی بسر کرنے کا ذریعہ بھی تھے۔ گھر کا ماحول خاصا مذہبی تھا۔ قرآن خوانی، نماز، روزہ اور پھر محرم کی عزاداری میں غیر معمولی شفقت میری گھٹی میں پڑے تھے۔ محرم کی مجلسوں میں مرثیے سن سن کر اور پڑھ پڑھ کر انیس سے متعارف ہوا، شعری ذوق کے اظہار کے لیے سلام، نوحے اور ٹوٹے پھوٹے مرثیے لکھنے شروع کیے۔

باقی صفحہ 52 پر

کتب موصولہ

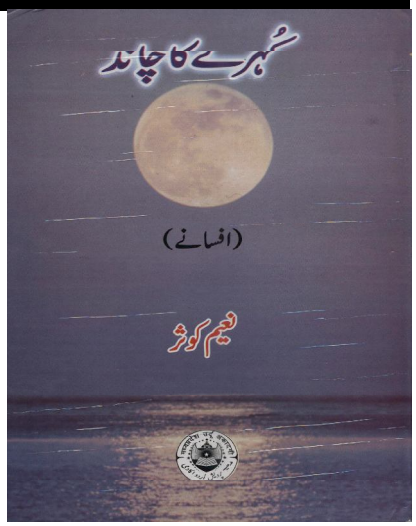

نام کتاب: کہرے کا چاند مصنف: نعیم کوثر
ناشر: مصنف

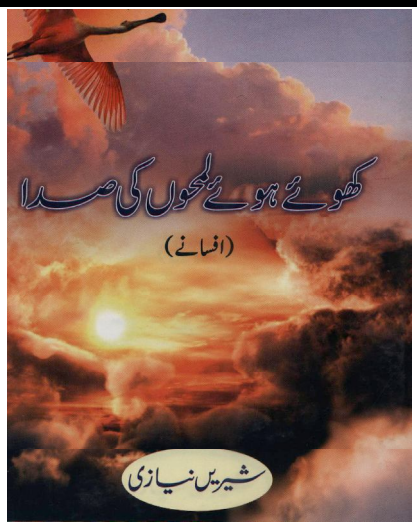

نام کتاب: کھوئے ہوئے لمحوں کا صدا مصنف: شیریں نیازی
ناشر: ظہیر نیازی، ریور سائڈ، بھرکنڈا، رام گڑھ

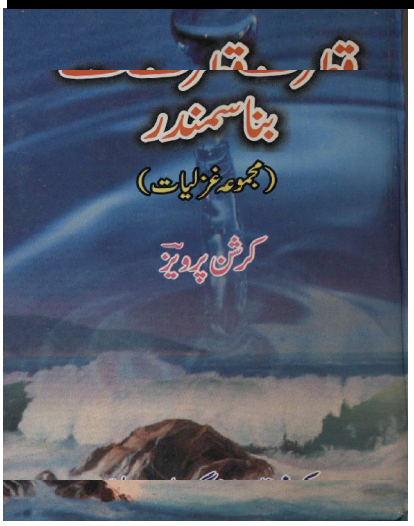

نام کتاب: قطرے قطرے سے بنا سمندر مصنف کرشن پرویز
ناشر: 26۔فرینڈز انکلیو، چنڈی گڑھ روڈ، کھرڑ (روپڑ)

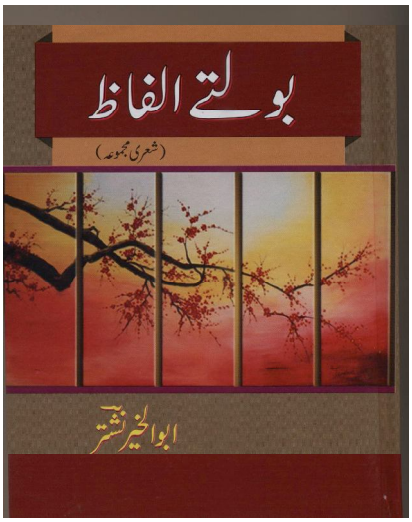

نام کتاب: بولتے الفاظ مصنف: ابوالخیر نشتر
ناشر: رہنما پبلی کیشنز، قرآن گھر، تقویٰ کالونی، چھاؤنی، بتیا

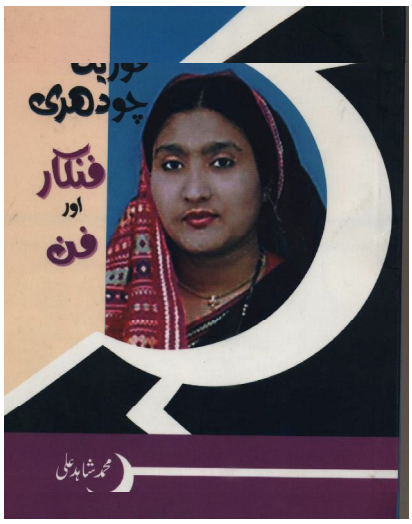

نام کتاب: فوزیہ چودھری فنکار اور فن مصنف: محمد شاہد علی
ناشر: تنویر پبلشرز، حیدرآباد

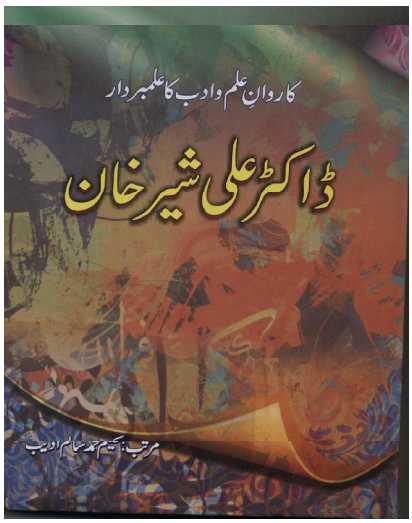

نام کتاب: ڈاکٹر علی شیر خان مرتب: حکیم محمد سالم ادیب
ناشر: مولانا آزاد لائبریری، ڈرائیور کوارٹر، کانٹاپوکھر، کولکاتا

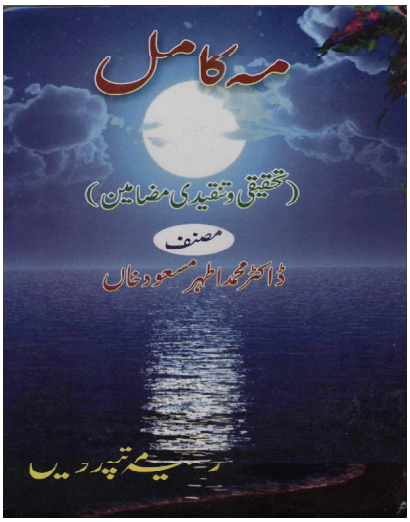

نام کتاب: مہ کامل مصنف: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں
ناشر: غوث منزل، تالاب ملا رام، رامپور۔244901

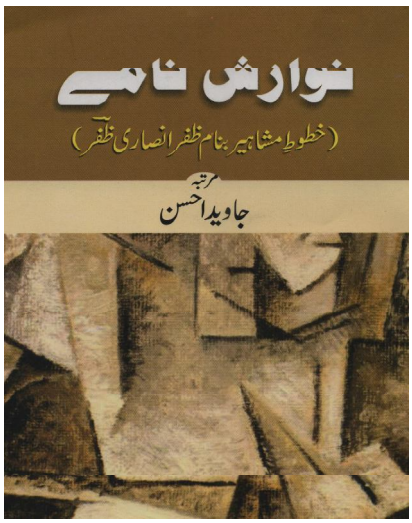

نام کتاب: نوازش نامے مرتبہ: جاوید احسن
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

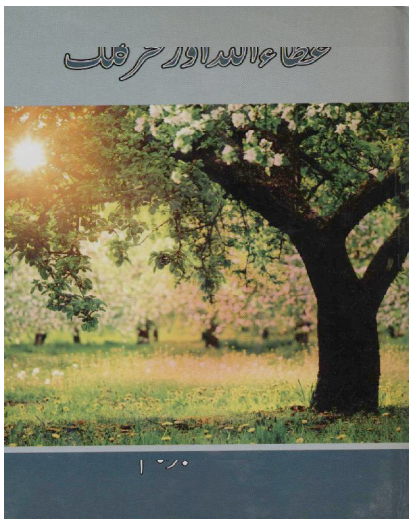

نام کتاب: عطاء اللہ اور سحر کلک مرتب: شبر امام
ناشر: اداریہ حسینی سماج، پالی کالونی، پٹنہ۔800008

Regd.No. D.L. (S)05/3198/2018-20
RNI No 948/57 (Delhi Post)
Date of Publication 12-13 December 2018
Date of Posting 15-16 December 2018

AAJKAL (Urdu)
Vol.77 No.06
January 2019

Licensed U (DN) 50/2018 - 20 to post
without pre-payment at RMS Delhi
Rs. 22/- Annual Rs. 230
ISSN 0971-846X

نائب صدر جمہوریہ ہند جناب ایم وینکیا نائیڈو نے 8 دسمبر 2018 کو وگیان بھون، نئی دہلی میں پبلی کیشنز ڈویژن کے شائع کردہ صدر جمہوریہ ہند کے ہندی اور انگریزی مجموعۂ تقاریر لوک تنتر کے سو راوردی ریپبلکن ایتھک کا رسم اجرا کیا۔ تصویر میں وزیر خارجہ محترمہ سشما سوراج، وزیر مملکت (آزادانہ چارج) اطلاعات ونشریات جناب راجیہ وردھن سنگھ راٹھور، سکریٹری اطلاعات ونشریات جناب امت کھرے، ڈائریکٹر جنرل پبلی کیشنز ڈویژن ڈاکٹر سادھنا راوت، چیئرمین پرسار بھارتی جناب سوریہ پرکاش اور جوائنٹ سکریٹری وزارت اطلاعات ونشریات، جناب وکرم سہائے کو بھی دیکھا جاسکتا ہے

پبلی کیشنز ڈویژن کے شائع کردہ صدر جمہوریہ ہند کی تقاریر کے مجموعوں لوک تنتر کے سو راوردی ریپبلکن ایتھک کی پہلی جلدیں، وزیر مملکت (آزادانہ چارج) اطلاعات ونشریات جناب راجیہ وردھن سنگھ راٹھور نے 8 دسمبر 2018 کو راشٹر پتی بھون، نئی دہلی میں صدر جمہوریہ ہند جناب رام ناتھ کووند کو پیش کیں۔ تصویر میں سکریٹری اطلاعات ونشریات جناب امت کھرے ڈائریکٹر جنرل پبلی کیشنز ڈویژن ڈاکٹر سادھنا راوت اور ادارے کے دیگر ذمہ داران نظر آرہے ہیں۔

Printed and Published by **Dr. Sadhana Rout,** DG, Publications Division, Soochna Bhawan, C.G.O. Complex, Lodhi Road, New Delhi-110003 Printed at M/s I G Printers Pvt Ltd. 104,DSIDC Complex, Okhla Indl Area Phase I New Delhi. 110020 Senior Editor : **Hasan Zia**